

جاسوسی دنیا

جلد نمبر 1

دلیر مجرم	1
خوفناک جنگل	2
عورت فروش کا قاتل	3
تجوری کا راز	4

ابن صفی

اسرار پبلی کیشنز

الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ

اردو بازار لاہور۔ فون : 7321970 - 7357022

جملہ حقوق محفوظ

اس ناول کے نام ، مقام ، کردار اور کہانی سے
تعلق رکھنے والے اداروں کے نام فرضی ہیں۔

پبلیشر.....خالد سلطان

پرنٹر.....یمانی پریس

سیل ڈپو: عثمان ٹریڈرز

الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ

اردو بازار لاہور۔ فون : 7321970

جاسوسی دنیا نمبر 1

دلیر مجرم

(مکمل ناول)

دیباچہ

”دلیر مجرم“ دوبارہ پیش کرتے وقت خیال ہوا کہ اس میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں، لیکن میری علالت نے باز رکھا اور پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ اس ناول میں آج تبدیلیاں کرنا جو ۵۲ء میں لکھا گیا ہو بالکل ایسا ہوگا جیسے کوئی بالغ آدمی اپنے بچپن کی تصویر میں ڈاڑھی اور مونچھوں کا اضافہ کر دے۔

لہذا یہ ناول جوں کا توں اپنی اصلی حالت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ اس زمانے کی کہانی ہے جب میاں حمید محبوباؤں کے لئے بڑی سنجیدگی سے دوچار آنسو بھی بہا لیا کرتے تھے اور کسی حد تک افلاطونی عشق کے بھی قائل تھے۔ بہر حال وہ اتنے اسماٹ نہیں تھے جتنے آج کل نظر آتے ہیں! فریدی کی شخصیت میں بھی تھوڑا کچا پن تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ آپ کو اس پوری کہانی پر چھایا ہوا نظر آئے گا۔

ابن صفی

عجیب و غریب قتل

”مجھے جانا ہی پڑے گا ماما۔“ ڈاکٹر شوکت نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اور کوٹ کی دوسری آستین میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

”ایڈیٹر تمہاری رکشا کرے اور اس کے سوا میں کہہ ہی کیا سکتی ہوں۔“ بوڑھی بیٹا دیوی بولیں۔ ”لیکن سر میں اچھی طرح مفلر لیٹ لو..... سردی بہت ہے۔“

”ماما.....!“ ڈاکٹر شوکت بچگانے انداز میں بولا۔ ”آپ تو مجھے بچہ ہی بنائے دے رہی ہیں..... مفلر سر میں لیٹ لوں..... بابا بابا.....!“

”اچھا بوڑھے میاں! جو تمہارا جی چاہے کرو۔“ بیٹا دیوی منہ پھیلا کر بولیں۔ ”مگر میں کہتی ہوں یہ کیسا کام ہو گیا..... نہ دن چمن نہ رات چمن۔ آج آپریشن کل آپریشن۔“

”میں اپنی اچھی ماما کو کس طرح سمجھاؤں کہ ڈاکٹر خود آرام کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کو آرام پہنچانے کے لئے ہوتا ہے۔“

”میں نے تو آج خاص طور سے تمہارے لئے میکرونی تیار کرائی تھی کیا رات کا کھانا بھی شہر ہی میں کھاؤ گے۔“ بیٹا دیوی بولیں۔

”کیا کروں مجبوری ہے..... اس وقت سات بج رہے ہیں۔ نو بجے رات کو آپریشن ہوگا۔ کیس ڈرانا زک ہے..... ابھی جا کر تیاری کرنی ہوگی..... اچھا خدا حافظ۔“

ڈاکٹر شوکت اپنی چھوٹی سی خوبصورت کار میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ سول ہسپتال میں اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ دماغ کے آپریشن کا ماہر ہونے کی

حیثیت سے اس کی شہرت دور دور تک تھی۔ حالانکہ ابھی اس کی عمر کچھ ایسی نہ تھی وہ چوبیس پچیس برس کا ایک خوبصورت اور وجیہہ نوجوان تھا۔ اپنی عادات و اطوار اور سلیقہ مندی کی بناء پر وہ سوسائٹی میں عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ قربانی کا جذبہ تو اس کی فطرت ثانیہ بن گیا تھا۔ آج کا آپریشن وہ کل پر بھی ٹال سکتا تھا لیکن اس کے ضمیر نے گوارہ نہ کیا۔

سیتا دیوی اکثر اس کی بھاگ دوڑ پر جھٹلا بھی جایا کرتی تھی۔ انہوں نے اسے اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا۔ وہ ہندو دھرم کو ماننے والی ایک بلند کردار خاتون تھیں انہوں نے اپنی دم توڑتی ہوئی سہیلی جعفری خانم سے جو وعدہ کیا تھا اسے وہ آج تک نبھائے جارہی تھی۔ انہوں نے ان کے بیٹے کو ان کی وصیت کے مطابق ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم دلا کر اس قابل کر دیا تھا۔ وہ آج سارے ملک میں اچھی خاصی شہرت رکھتا تھا۔ اگرچہ شوکت کی والدہ اس کی تعلیم کے لئے معقول رقم چھوڑ کر مری تھیں۔ لیکن کسی دوسرے کے بچے کو پالنا آسان کام نہیں اور پھر بچہ بھی ایسا جس کا تعلق غیر مذہب سے ہو۔ اگر وہ چاہتی تو اسے اپنے مذہب پر چلا سکتی تھیں لیکن ان کی نیک نیتی نے اسے گوارہ نہ کیا۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اس کی دینی تعلیم کا بھی معقول انتظام کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نوجوان ہونے پر بھی شوکت علی ہی رہا۔ سیتا دیوی کے برادری کے لوگوں نے ایک مسلمان کے ساتھ رہنے کی بناء پر ان کا بایکاٹ کر رکھا تھا مگر وہ اپنے مذہب کی پوری طرح پابند تھیں اور شوکت کو اس کے مذہبی احکام کی تعمیل کے لئے مجبور کرتی رہتی تھیں۔ وہ ڈاکٹر شوکت اور ایک ملازمہ کے ساتھ نشاط نگر نامی قصبہ میں رہ رہی تھیں۔ جو شہر سے پانچ میل کی دوری پر واقع تھا۔ یہ ان کی اپنی ذاتی کوشش تھی۔ وہ جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کے شوہر اچھی خاصی جائیداد کے مالک تھے جو کسی قریبی عزیز کے نہ ہونے کی بناء پر پوری کی پوری انہیں کے حصے میں آئی تھی۔

ڈاکٹر شوکت کے چلے جانے کے بعد انہوں نے ملازمہ سے کہا۔ ”میرے کمرے میں قدیل مت جلا نا۔ میں آج شوکت ہی کے کمرے میں سوؤں گی۔ وہ آج رات بھر تھکتا رہے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ جب وہ صبح کو آئے تو اپنے بستر کو برف کی طرح ٹھنڈا اور بخ پائے۔ جاؤ

جا کر اس کا بستر بچھا دو۔“

نوجوان خادمہ انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ آج پہلی بار اس نے انہیں اس قسم کی گفتگو کرتے سنا تھا۔ جو پر معنی بھی تھی اور مضحکہ خیز بھی۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ پھر اسے ایک ماما بھرے دل کی جھلک سمجھ کر خاموش ہو رہی۔

”کیا سوچ رہی ہو۔“ سیٹا دیوی بولیں۔

”تو کیا آج رات ہم تنہا رہیں گے؟“ خادمہ اپنی آواز دھیمی کر کے بولی۔ ”وہ شخص آج

پھر آیا تھا۔“

”کون شخص.....؟“

”میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہے لیکن میں نے کل رات کو بھی اس کو باغ میں چھپ چھپ کر چلتے دیکھا تھا۔ کل تو میں سمجھتی تھی کہ شاید وہ کوئی راستہ بھولا ہوا راگبیر ہوگا۔ مگر آج چھ بجے کے قریب وہ پھر دکھائی دیا تھا۔“

”اچھا.....!“ سیٹا دیوی سوچ کر بولیں۔ ”وہ شاید ہماری مرغیوں کی تاک میں ہے۔“

میں صبح ہی تھانے کے دیوان سے کہوں گی۔“

سیٹا دیوی نے یہ کہہ کر اس کو اطمینان دلا دیا۔ لیکن خود الجھن میں پڑ گئیں۔ آخر یہ پراسرار آدمی ان کی کوشی کے گرد کیوں منڈلاتا رہتا ہے۔ انہیں اپنے مذہبی ٹھیکیداروں کی دھمکی اچھی طرح یاد تھی۔ لیکن اتنے عرصے کے بعد ان کی طرف سے بھی کوئی خطرناک اقدام کوئی خاص معنی نہ رکھتا تھا۔ اس قسم کی نہ جانے کتنی گتھیاں ان کے ذہن میں رینگتی تھیں۔ آخر کار تھک ہار کر تسکین قلب کے لئے انہیں اپنے پہلے ہی خیال کی طرف لوٹ آنا پڑا۔ یعنی وہ شخص وہ کوئی معمولی چور تھا جسے ان کی مرغیاں پسند آگئی تھیں۔ جیسے ہی تھانے کے گھنٹے نے دس بجائے وہ سونے کے لئے ڈاکٹر شوکت کے کمرے میں چلی گئیں، انہوں نے رات کھانا بھی نہیں کھایا۔

خادمہ ان کی افتاد طبع سے واقف تھی۔ اس لئے اس نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ لیٹنے ہی والی تھی کہ اس نے صدر دروازے

کو دھماکے کے ساتھ بند ہوتے سنا۔ اسے خیال پیدا ہوا کہ ڈاکٹر شوکت خلاف توقع واپس آ گیا ہے۔ وہ برآمدے میں نکل آئی۔ باغ میں سیٹا دیوی کی غصیلی آواز سنائی دی۔ وہ کسی مرد سے تیز لہجے میں بات کر رہی تھیں۔ وہ حیرت سے سننے لگی۔ وہ ابھی باہر جانے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ سیٹا دیوی بڑبڑاتی ہوئی آتی دکھائی دیں۔

”تم.....!“ وہ بولیں۔ ”ارے لڑکی تو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑی ہے۔ اس سردی میں بغیر کبل اوڑھے باہر نکل آئی ہے..... نہ جانے کیسی ہیں آج کل کی لڑکیاں۔“

”کون تھا.....!“ خادمہ نے ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہی آدمی تو نہیں تھا۔“ خادمہ نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

”نہیں وہ نہیں تھا۔ سردی بہت ہے۔ صبح بتاؤں گی..... اچھا اب جاؤ۔“

خادمہ متحیر ہوتی ہوئی چلی گئی۔ ہر چند کہ اس واقعہ کی کوئی اہمیت نہ رہی ہو لیکن یہ اسے حد درجہ پر اسرار معلوم ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خزانے لینے لگی۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے جب ڈاکٹر شوکت واپس آیا تو اس نے ملازمہ کو حد درجہ پریشانی اور سر اسیمگی کی حالت میں پایا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سیٹا دیوی خلاف معمول ابھی سو رہی ہیں۔ حالانکہ ان کا روزانہ کام معمول تھا کہ صبح تقریباً پانچ بجے ہی اٹھ کر پوجا پاٹھ کے انتظام میں مشغول ہو جایا کرتی تھیں۔ شوکت کو بھی اس واقعہ سے تشویش ہو گئی۔ لیکن اس نے پھر سوچا کہ شاید رات میں زیادہ دیر تک جاگی ہوں گی۔ اس نے ملازمہ کو اطمینان دلا کر ناشتہ لانے کو کہا۔ نو بج گئے لیکن سیٹا دیوی نہ اٹھیں۔ اب شوکت کی پریشانی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ اس نے دروازہ پینٹا شروع کیا..... لیکن بے سود..... اندر سے کوئی جواب نہ ملا تھا۔ ہار کر اس نے ایک بڑھئی بلوایا۔

دروازہ ٹوٹنے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔

سیٹا دیوی سر سے پاؤں تک کبل اوڑھے چپ لپٹی ہوئی تھی اور ان کے سینے میں ایک خنجر اس طرح پھنس چکا تھا کہ صرف ایک دستہ نظر آ رہا تھا۔ بستر خون سے تر تھا۔

ڈاکٹر شوکت ایک مضبوط دل کا آدمی ہوتے ہوئے بھی تھوڑی دیر کے لئے بیہوش سا ہو گیا۔ ہوش آتے ہی وہ بچوں کی طرح سسکیاں لیتا ہوا زمین پر گر پڑا۔

انسپکٹر فریدی

سارے گھر میں ایک عجیب سی ماتی فضا طاری تھی۔ قصبہ کے تھانے پر اطلاع ہو گئی تھی اور اس وقت ایک سب انسپکٹر اور دو ہیڈ کانسیبل مقتولہ کے کمرے کے سامنے بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ خادمہ کے بیان پر انہوں نے اپنی تشویش کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے تھے۔ ان کے خیال میں وہی پراسرار آدمی قاتل تھا جو رات کو باغ میں ٹہکتا ہوا پایا گیا تھا اور بیٹا دیوی رات میں اسی سے جھگڑا کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر شوکت ان کی بحثوں سے قطعی غیر مطمئن تھا جیسے جیسے وہ اپنی تجربہ کاری کا اظہار کر رہے تھے اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے قصبہ کی پولیس کو ناکارہ سمجھتا تھا۔ اسی لئے اس نے محکمہ سراغ رسانی کے انسپکٹر فریدی کو ایک نجی خط لکھ کر بلوایا تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ فریدی ان چند انسپکٹروں میں تھا جو بہت ہی اہم کاموں کے لئے وقف تھے لیکن ذاتی تعلقات کی بناء پر ڈاکٹر شوکت کو پورا یقین تھا کہ اسے یہ کیس سرکاری طور پر نہ بھی سونپا گیا تو وہ نجی طور پر اسے اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد انسپکٹر فریدی بھی اپنے اسٹنٹ سرجنٹ حمید کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ انسپکٹر فریدی تیس سال کا ایک قوی ریکل جوان تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی کے نیچے دو بڑی بڑی خواب آلود آنکھیں اس کی ذہانت اور تدبیر کی آئینہ دار تھیں۔ اس کے لباس کے رکھ رکھاؤ اور تازہ شیو سے معلوم ہو رہا تھا وہ ایک با اصول اور سلیقہ مند آدمی ہے۔ سرجنٹ حمید کے خدو خال میں قدرے زمانہ پن کی جھلک تھی۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے جا ناز برداریوں اور اپنے حسن کی نمائش کا عادی ہے۔ اس نے کوئی بہت ہی تیز خوشبو والا اینٹ رگا

رکھا تھا۔ اس کی عمر چوبیس سال سے زیادہ نہ تھی لیکن اس چھوٹی سی عمر میں بھی وہ بلا کا ذہین تھا۔ اسی ذہانت کی بناء پر انسپکٹر فریدی کے تعلقات اس سے دوستانہ تھے۔ دونوں کی آپس کی گفتگو سے افسری یا ماتحتی کا پہ لگانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

تھانے کے سب انسپکٹر اور دیوان ان کی غیر متوقع آمد سے گھبرا سے گئے کیونکہ انہیں ان کے آنے کی اطلاع نہ تھی۔ انہیں ان کی غیر ضروری آمد کچھ ناگواری گذری۔

”ڈاکٹر شوکت.....!“ فریدی نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس نقصان کی سلائی ناممکن ہے البتہ رسمی طور پر میں اپنے غم کا اظہار ضرور کروں گا۔“

”انسپکٹر آج میری ماں مر گئی۔“ شوکت کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

”صبر کرو..... تمہیں ایک مضبوط دل کا آدمی ہونا چاہئے۔“ فریدی نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے جواب دیا۔

”کہئے داروغہ جی کچھ سراغ ملا۔“ اس نے سب انسپکٹر کی طرف مڑ کر کہا۔

”ارے صاحب! ہم بچپارے بھلا سراغ لگانا کیا جانیں۔“ سب انسپکٹر طنزیہ انداز میں بولا۔

فریدی نے جواب کی تلخی محسوس ضرور کی لیکن وہ صرف مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

”شوکت صاحب! یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں آج کل چھٹی پر ہوں۔“ فریدی بولا۔ ”اور پھر دوسری بات یہ کہ عموماً قتل کے کیس اس وقت ہمارے پاس آتے ہیں جب سول پولیس تفتیش میں ناکام رہتی ہے۔“

تھانے کے انسپکٹر کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

انسپکٹر فریدی نے اس تغیر کو محسوس کر لیا اور اپنے مخصوص دل آزار اور شرارت آمیز لہجہ میں بولا۔ ”لیکن میں ذاتی تعلقات کی بناء پر نجی طور پر اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لوں گا۔“ تھانے کے سب انسپکٹر کی آنکھوں کی چمک دفعتاً اس طرح غائب ہو گئی جیسے سورج کا چہرہ سیاہ بادل ڈھانپ لیتے ہیں۔ اس کا منہ لٹک گیا۔

فریدی نے واقعات سننے کے بعد خادمہ کا بیان لینے کی خواہش ظاہر کی۔ خادمہ نے

شروع سے آخر تک رات کے سارے واقعات دہرا دیئے۔

”کیا تم بتا سکتی ہو کہ رات میں تم نے ان واقعات کے بعد بھی کوئی آواز سنی تھی۔“

”جی نہیں..... سوائے اس کے کہ وہ دیوی جی کے بڑبڑانے کی آواز تھی۔ وہ اکثر سوتے

وقت بڑبڑایا کرتی تھیں۔“

”ہوں..... کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کیا بڑبڑا رہی تھیں۔“

”کچھ بے ربط باتیں تھیں۔ ٹھہریے یاد کر کے بتاتی ہوں۔ ہاں ٹھیک یاد آیا..... وہ راج

روپ نگر..... راج روپ نگر چلا رہی تھیں۔ میں نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ کیونکہ میں ان

کی عادت سے واقف تھی۔“

”راج روپ نگر.....!“ فریدی نے دھیرے سے دہرایا اور کچھ سوچنے لگا۔

”حمید..... تم نے اس سے پہلے بھی یہ نام سنا ہے؟“

حمید نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ڈاکٹر شوکت تم نے۔“

”میں نے تو آج تک نہیں سنا۔“

”کیا سیتا دیوی نے بھی یہ نام کبھی نہیں لیا۔“

”میری یادداشت میں تو نہیں۔“ ڈاکٹر شوکت نے ذہن پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

”ہوں..... اچھا.....!“ فریدی نے کہا۔ ”اب میں ذرا لاش کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ سب لوگ اس کمرے میں آئے جہاں لاش پڑی ہوئی تھی۔ چارپائی کے سرہانے والی

کھڑکی کی کھلی ہوئی تھی۔ اس میں سلاخیں نہیں تھیں۔ انسپکٹر فریدی دیر تک لاش کا معائنہ کرتا

رہا۔ پھر اس نے وہ چھرا سب انسپکٹر کی اجازت سے مقتولہ کے سینے سے کھینچ لیا اور اس کے

دستوں پر انگلیوں کے نشانات ڈھونڈنے لگا۔

پھر کھڑکی کی طرف گیا اور جھک کر نیچے کی طرف دیکھنے لگا۔ کھڑکی سے تین فٹ نیچے

تقریباً ایک فٹ چوڑی کارنس تھی جس سے ایک بانس کی سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ کھڑکی پر پڑی ہوئی

گرد کی تہہ کئی جگہ سے صاف تھی اور ایک جگہ ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کے نشان۔ ”یہ تو صاف ظاہر ہے کہ قاتل اس کھڑکی سے داخل ہوا۔“ فریدی نے کہا۔

”یہ تو اتنا صاف ہے کہ گھر کی خادمہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔“ تھانے کے سب انسپکٹر نے مضحکہ اڑانے کے انداز میں کہا۔

فریدی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے خنجر کا جائزہ لینے لگا۔
 ”قاتل نے دستانے پہن رکھے تھے اور وہ ایک مشاق خنجر باز معلوم ہوتا ہے۔“ انسپکٹر فریدی بولا۔ ”اور وہ ایک غیر معمولی طاقتور انسان ہے۔۔۔۔۔ داروغہ جی اس خنجر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔“

”خنجر۔۔۔۔۔ جی ہاں یہ بھی بہت مضبوط معلوم ہوتا ہے۔“ سب انسپکٹر مسکرا کر بولا۔
 ”جی نہیں میں اس کی ساخت کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“
 ”اس کی ساخت کے بارے میں صرف لوہاری بتا سکتے ہیں۔“
 ”جی نہیں۔۔۔۔۔ میں بھی بتا سکتا ہوں۔ اس قسم کے خنجر نیپال کے علاوہ اور کہیں نہیں بنتے۔“
 ”نیپال۔۔۔۔۔!“ ڈاکٹر شوکت تحیر آمیز لہجہ میں بولا اور بے تابانہ انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا بات ہے۔“ فریدی اسے گھورتا ہوا بولا۔
 ”کوئی بات نہیں۔“ شوکت نے خود پر قابو حاصل کرتے ہوئے کہا۔
 ”خیر ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس قسم کے خنجر سوائے نیپال کے اور کہیں نہیں بنائے جاتے اور ڈاکٹر میں تم سے کہوں گا کہ۔۔۔۔۔!“ ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ایک کانشیبل نے آ کر اطلاع دی کہ اس شخص کا پتہ لگ گیا ہے جس سے کل رات سیٹا دیوی کا جھگڑا ہوا تھا۔
 سب لوگ بے تابانہ انداز میں دروازے کی طرف بڑھے۔ باہر ایک باوردی کانشیبل کھڑا تھا۔ آنے والے کانشیبل نے بتایا رات سیٹا دیوی اسی سے جھگڑ رہی تھی۔ وہ رات اس طرف سے گزر رہا تھا کہ سیٹا دیوی نے اسے پکارا۔ اسے جلدی تھی کیونکہ وہ گشت پر جا رہا تھا۔ لیکن وہ

پھر بھی چلا آیا۔ سیتا دیوی نے اسے بتایا کہ کوئی آدمی ان کی مرغیوں کی تاک میں ہے اور اس سے ادھر کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ اس نے جواب دیا کہ پولیس مرغیاں تاکنے کے لئے نہیں ہے اور پھر وہ دوسری چوکی کا کانشیل ہے، اسی پر بات بڑھ گئی اور جھگڑا ہونے لگا۔

تھانے کا داروغہ اسے الگ لے جا کر اس سے پوچھ گچھ کرنے لگا اور فریدی نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”ہاں تو ڈاکٹر میں تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ یہ خنجر دراصل تمہارے سینے میں ہونا چاہئے تھا۔ سیتا دیوی دھوکے میں قتل ہو گئیں اور جب قاتل کو اپنی غلطی کا علم ہوگا تو وہ پھر تمہارے پیچھے پڑ جائے گا۔ اب پھر اسی کمرے میں چل کر میں اس کی تشریح کروں گا۔“

اس انکشاف پر سب کے سب بوکھلا گئے۔ شوکت گھبراہٹ میں جلدی جلدی پلکیں جھپکا رہا تھا۔ داروغہ جی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں اور سر جنت حمید انہیں مضحکہ خیز انداز میں گھور رہا تھا۔

سب لوگ پھر لاش والے کمرے میں واپس آئے۔ انسپکٹر فریدی کھڑکی کی کانس پر اتر گیا اور اس لائن کے سارے کمروں کی کھڑکیوں کا جائزہ لیتا ہوا لوٹ آیا۔

اب معاملہ بالکل ہی صاف ہو گیا کہ سیتا دیوی ڈاکٹر ہی کے دھوکے میں قتل ہوئی ہیں۔ اگر قاتل سیتا دیوی کو قتل کرنا چاہتا تھا تو اسے یہ کیا معلوم کہ سیتا دیوی شوکت کے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ اگر وہ تلاش کرتا ہوا اس کمرے تک پہنچا تھا تو دوسری کھڑکیوں پر بھی اس قسم کے نشانات ہو سکتے تھے جیسے کہ اس کھڑکی پر ملے ہیں اور پھر سیتا دیوی کے قتل کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی وہ ان کی جائیداد۔ اگر ان کا ترکہ ان کے کسی عزیز کو پہنچتا ہوتا تو وہ انہیں اب سے دس برس قبل ہی قتل کر دیتا یا کرا دیتا۔ جبکہ انہوں نے اپنی جائیداد دھرم شالہ کے نام وقف کرنے کا صرف ارادہ ہی کیا تھا۔ اب جبکہ دس سال گزر چکے ہیں اور جائیداد کے متعلق پوری قانونی وصیت محفوظ ہے ان کے قتل کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آ سکتی اگر قاتل چوری کی نیت سے اتفاقاً اس کمرے میں داخل ہوا جس میں وہ سو رہی تھیں تو کیا وجہ ہے کہ کوئی چیز چوری نہیں کی گئی۔

”ممکن ہے کہ اس کمرے میں اس کے داخل ہوتے ہی مقتولہ جاگ اٹھی ہو اور وہ پکڑے

جانے کے خوف سے اسے قتل کر کے کچھ چرائے بغیر ہی بھاگ کھڑا ہوا۔“ داروغہ جی نے اپنی دانست میں بڑا حیر مارا۔

”مائی ڈیر.....!“ فریدی جوش میں بولا۔ ”لیکن میں ثابت کر سکتا ہوں کہ قاتل حملہ کے بعد کافی دیر تک اس کمرے میں ٹھہرا ہے۔“

سب انسپکٹر کے چہرے پر تسخّر آمیز مسکراہٹ پھیل گئی اور سرجنٹ حمید اسے دانت پیس کر گھورنے لگا۔

انسپکٹر فریدی نے نہایت سکون کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ ”جس وقت شوکت نے مقتولہ کو دیکھا وہ سر سے پیر تک کمبل اوڑھے ہوئی تھی ظاہر ہے کہ اس سے پہلے کوئی کمرے میں داخل بھی نہ ہو سکتا تھا کیونکہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ لہذا لاش پر پہلے شوکت ہی کی نظر پڑی۔ اس لئے کسی اور کے منہ ڈھانکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب ذرا لاش کے قریب آئیے..... داروغہ جی میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ یہ دیکھئے مقتولہ کا نچلا ہونٹ اس کے دانتوں میں دب کر رہ گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل نے ایک ہاتھ سے مقتولہ کا منہ دبایا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وار کیا تھا۔ پھر فوراً ہی منہ دبائے ہوئے اس کے پیروں پر بیٹھ گیا تھا تا کہ وہ جنبش نہ کر سکے اور وہ اس حالت میں اس وقت تک رہا جب تک کہ مقتولہ نے دم نہ توڑ دیا۔ ہونٹ کا دانتوں میں دبا ہونا ظاہر کر رہا ہے کہ وہ تکلیف کی شدت میں صرف اتنا کر سکی کہ اس نے دانتوں میں ہونٹ لیا لیکن قاتل کے ہاتھ کے دباؤ کی وجہ سے ہونٹ پھر اپنی اصلی حالت پر نہ آ سکا اور اسی حالت میں لاش ٹھنڈی ہو گئی۔ قاتل کو اپنے مقصد کی کامیابی پر اتنا یقین تھا کہ اس نے کمبل الٹ کر اپنے شکار کا چہرہ تک دیکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ ممکن ہے کہ اس نے بعد میں منہ کھول کر دیکھا بھی ہو مگر نہیں اگر ایسا کرتا تو پھر دوبارہ ڈھانک دینے کی کوئی ایسی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ خودکشی کا کیس ہو۔“ سب انسپکٹر نے پھر اپنی قابلیت کا اظہار کیا۔

”جناب والا.....!“ سرجنٹ حمید بولا۔ ”اتنی عمر آئی لیکن کمبل اوڑھ کر آرام سے منجر

گھونپ لینے والا ایک بھی نہ ملا کہ میں اس کی قدر کر سکتا۔“

سب انسپکٹر نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

انسپکٹر فریدی ان سب باتوں کو سنی ان سنی کر کے ڈاکٹر شوکت کو مخاطب کر کے بولا۔

”ڈاکٹر..... تمہاری جان خطرے میں ہے۔ ہر ممکن احتیاطی تدابیر کرو۔ یہ پلاٹ تمہارے

عقل کے لئے بنایا گیا تھا۔ سوچ کر بتاؤ کیا تمہارا کوئی ایسا دشمن ہے جو تمہاری جان تک لے لینے میں دریغ نہ کرے گا۔“

”میری دانست میں تو کوئی ایسا آدمی نہیں۔ آج تک میرے تعلقات کسی سے خراب

نہیں رہے لیکن ٹھہریے..... آپ کو یاد ہوگا کہ میں نیپالی خنجر کے تذکرے پر بے اختیار چونک پڑا تھا..... تقریباً پندرہ یوم کا تذکرہ ہے کہ ایک رات میں ایک بہت ہی خطرناک قسم کا آپریشن کرنے جا رہا تھا کہ ایک اچھی حیثیت کا نیپالی میرے پاس آیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اسی وقت ایک مریض کو دیکھ لوں۔ جس کی حالت خطرناک تھی۔ میں نے معذوری ظاہر کی۔ وہ رونے اور گڑ گڑانے لگا۔ لیکن میں مجبور تھا۔ کیونکہ پہلے ہی سے ایک خطرناک کیس میرے پاس تھا۔ خطرہ تھا کہ اسی رات اس کا آپریشن نہ کیا گیا تو مریض کی موت واقع ہو جائے گی۔ آخر جب وہ نیپالی مایوس ہو گیا تو مجھے برا بھلا کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔“

دوسرے دن صبح جب میں ہسپتال جا رہا تھا تو چرچ روڈ کے چوراہے پر پٹرول لینے کے لئے رکا تو وہاں مجھے وہی نیپالی نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے نفرت سے برا سامنہ بنایا اور اپنی زبان میں کچھ بڑبڑاتا ہوا پھر میری طرف مکاتان کر کہنے لگا۔

”شالا..... ہمارا آدمی مر گیا۔ اب ہم تمہاری خبر لے لے گا۔“ میں نے ہنس کر موٹر اشارت کی۔

”ہوں اچھا.....!“ فریدی بولا۔ ”اس کی شکل و صورت کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو۔“

”یہ ذرا مشکل ہے کیونکہ مجھے تو سارے نیپالی ایک ہی جیسی شکل و صورت کے لگتے ہیں۔“ ڈاکٹر شوکت نے جواب دیا۔

”خیر اپنی حفاظت کا خاص خیال رکھو..... اچھا داروغہ جی میرا کام ختم..... ڈاکٹر شوکت میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اس کیس کو میں اپنے ہاتھ میں لوں گا لیکن مجھے افسوس ہے کہ بعض وجوہ کی بناء پر ایسا نہ کر سکوں گا۔ میرا خیال ہے کہ داروغہ جی بحسن و خوبی اس کام کو انجام دیں گے۔ اچھا اب اجازت چاہوں گا۔ ہاں ڈاکٹر ذرا کار تک چلو میں تمہارے تحفظ کے لئے تمہیں کچھ ہدایات دینا چاہتا ہوں..... اچھا داروغہ جی آداب عرض۔“

کار کے قریب پہنچ کر فریدی نے جیب سے ایک چھوٹا سا پستول نکالا اور ڈاکٹر شوکت کو تھما دیا۔ ”یہ لو حفاظت کے لئے میں تمہیں دیتا ہوں..... اور کل تک اس کا لائسنس بھی تم تک پہنچ جائے گا۔“

”جی نہیں..... شکریہ اس کی ضرورت نہیں.....!“ ڈاکٹر شوکت نے منہ پھلا کر جواب دیا۔ ”الحق آدمی بگڑ گئے کیا.....؟ کیا سچ مچ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اس واقعہ کی تفتیش نہ کروں گا۔ ہاں ان گدھوں کے سامنے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ نجی تفتیش سے انکار کر دوں۔ یہ کم بخت صرف بڑے افسروں تک شکایت پہنچانے میں قابل ہوتے ہیں۔“ ڈاکٹر شوکت کے چہرے پر رونق آ گئی اور اس نے ریوالور لے کر جیب میں ڈال لیا۔

”دیکھو جب بھی کوئی ضرورت پیش آئے مجھے بلوالینا۔ بہت ممکن ہے کہ میں دس بجے رات تک پھر آؤں۔ ہوشیاری سے رہنا..... اچھا خدا حافظ۔“

ڈرائیور نے کار اشارت کر دی۔

سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔

قاتل کا قتل

”کیوں بھی کہو کیسا کیس ہے۔“ فریدی نے سگار سلاک کر سار جنٹ حمید کی طرف جھکتے

ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں تو ایسا دلچسپ کیس بہت دنوں کے بعد ہاتھ آیا ہے۔“
 ”آپ تو دن رات کیسوں ہی کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ کچھ حسین دنیا کی طرف بھی
 نظر دوڑائیے۔“ حمید بیزاری سے بولا۔

”تو اس کا یہ مطلب کہ تم اس میں دلچسپی نہ لو گے۔ میں تو آج ہی تفتیش شروع کر رہا ہوں۔“
 ”بس مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ میں نے تصنع اوقات کیلئے ایک ماہ کی چھٹی نہیں لی۔“
 ”بیکاری میں تمہارا دل نہ گھبرائے گا.....؟“

”بیکاری کیسی۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے ابھی حال ہی
 میں ایک عدد عشق کیا ہے۔“
 ”ایک عدد.....!“ فریدی نے ہنس کر کہا۔ ”اگر اس تفتیش کے سلسلے میں کئی عدد اور
 ہو جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔“

”شاید آپ کا اشارہ ڈاکٹر شوکت کی نو جوان خادمہ کی طرف ہے۔“ حمید منہ بنا کر بولا۔
 ”معاف کیجئے گا..... میرا معیار اتنا گرا ہوا نہیں ہے۔“

”بڑے گدھے ہو تم..... مجھے اس کا خیال بھی نہ تھا۔“ فریدی نے سگار منہ سے نکال کر
 کہا۔ ”خیر ہٹاؤ..... کوئی اور بات کریں۔ ہاں بھی سنا ہے کہ دو تین دن ہوئے ریلوے گراؤنڈ پر
 سرکس آیا ہوا ہے، بہت تعریف سنی ہے، چلو آج سرکس دیکھیں۔ صرف ساڑھے چار بجے ہیں۔
 کھیل سات بجے شروع ہوگا۔ اتنی دیر میں ہم لوگ کھانا بھی کھالیں گے۔“

”ارے..... یہ کیا پد پر ہیزی کرنے جا رہے ہیں۔ ارے لاجول والا..... آپ اور
 لنویات..... یقین نہیں آتا کیا آپ نے سراغ رسانی سے توبہ کر لی۔“ حمید نے عجیب سا منہ بنا
 کر کہا۔

”تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہاں میں بے مطلب جا رہا ہوں۔ تم دیکھو گے کہ سراغ رسانی
 کیسے کی جاتی ہے۔“ فریدی نے جواب دیا۔

”معاف کیجئے گا..... اس وقت تو آپ کسی چھ پیسے والے جاسوسی ناول کے مشہور جاسوس

کی طرح بول رہے ہیں۔“ حمید بولا۔

”تم نے تو سرکس کا اشتہار دیکھا ہوگا۔ بھلا بتاؤ کس کھیل کی خصوصیت کیساتھ تعریف تھی۔“

”ایک نیپالی کا موت کے خنجر کا کھیل۔“ حمید نے جواب دیا۔ پھر اچھل کر کہنے لگا۔ ”کیا

مطلب.....!“

فریدی نے اس کے سوال کو ٹالتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اس کھیل میں ہے کیا..... تم تو ایک

بار شاید دیکھ بھی آئے ہو۔“

”ہاں ایک لڑکی لکڑی کے تختے سے لگ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور ایک نیپالی اس طرح خنجر

پھینکتا ہے کہ وہ اس کے چاروں طرف لکڑی کے تختے میں چبھتے جاتے ہیں۔ آخر میں جب وہ

ان خنجروں کے درمیان سے نکلتی ہے تو لکڑی کے تختے پر جیسے ہوئے خنجروں میں اس کا خاکہ سا

بنارہ جاتا ہے۔ بھی واقعی کمال ہے، اگر خنجر ایک سوت بھی آگے بڑھ کر پڑے تو لڑکی کا قلع قمع

ہو جائے۔“

”اچھا ان خنجروں کی لمبائی کیا ہوگی۔“ فریدی نے سگار کا کش لے کر کہا۔

”میرے خیال سے وہ خنجر دیسے ہی ہیں جیسا کہ آپ نے مقولہ کے سنے سے نکالا تھا۔“

”بہت خوب.....!“ فریدی اطمینان سے بولا۔ ”اچھا تو یہ بتاؤ کہ خنجر کا کتنا حصہ لکڑی کے

تختے میں گھس جاتا ہوگا۔“

”میرے خیال میں چوتھائی۔“

”معمولی طاقت والے کے بس کا روگ نہیں۔“ فریدی نے حمید کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے

جوش میں کہا۔ ”اچھا میرے دوست آج سرکس ضرور دیکھا جائے گا۔“

”آخر آپ کا مطلب کیا ہے؟“ حمید بے چینی سے بولا۔

”ابھی فی الحال تو کوئی خاص مطلب نہیں۔ بقول تمہارے ابھی تو میری اسکیم کسی چھپے

والے ناول کے سراغ رساں ہی کی اسکیم کی طرح معلوم ہو رہی ہے آگے اللہ مالک ہے۔“

”آخر کچھ بتائیے تو.....!“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ سیتا دیوی کے قتل میں اسی نیپالی کا ہاتھ ہو۔“

”یوں تو اس کے قتل میں میرا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔“ حمید ہنس کر بولا۔

”تم نہیں سمجھتے..... ایک کچم شیم عورت کی لاش کو پھڑکنے سے روک دینا کسی معمولی

طاقت والے آدمی کا کام نہیں۔ ایک ذبح کئے ہوئے مرغ کو سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے۔ پھر جس

فحش نے ڈاکٹر شوکت کو دھمکی دی تھی وہ بھی نیپالی ہی تھا۔ ایسی صورت میں کیوں نہ ہم اس شبہ

سے فائدہ اٹھائیں۔ میں یہ وثوق کے ساتھ نہیں کہتا کہ قتل میں سرکس والے نیپالی ہی کا ہاتھ

ہے۔ پھر بھی دیکھ لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ اگر کوئی سراغ نہ مل سکا تو تفریح ہی ہو جائے گی۔“

”خیر میں سرکس دیکھنے سے انکار نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں تقریباً دو درجن لڑکیاں کام

کرتی ہیں۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہاں کھیل کے دوران میں آپ بحث مباحثہ کر کے

میرا مزہ کر کر لیں۔“

”تم چلو تو سہی..... مجھے یہ بھی معلوم ہے۔“ فریدی نے بجا ہوا سگار سلگا کر کہا۔

شہر پہنچ کر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے ایونٹک نیوز میں نشاط نگر کے

قتل کا حال پڑھا۔ اس پر انسپکٹر فریدی کے دلائل کا ایک ایک لفظ تحریر تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ

انسپکٹر فریدی نے نجی طور پر موقعہ واردات کا معائنہ کیا تھا لیکن انہوں نے نجی تفتیش کرنے سے

انکار کر دیا ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ انسپکٹر فریدی چھ ماہ کی رخصت پر ہیں۔ اس لئے خیال

ہوتا ہے کہ شاید سرکاری طور پر بھی یہ کام ان کے سپرد نہ کیا جاسکے۔

”میرے خیال سے جس شخص کو ہم لوگ ڈاکٹر کا پڑوسی سمجھ رہے تھے وہ ایونٹک نیوز کا نامہ

نگار تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”اب تک تو حالات ہمارے ہی موافق ہیں۔ اس خبر کا آج ہی شائع

ہو جانا بڑا اچھا ہوا۔ اگر واقعی سرکس والا نیپالی ہی قاتل ہے تو ہم باآسانی اس پر اس خبر کا رد عمل

دیکھ سکیں گے۔“

”ہوں.....!“ حمید کچھ سوچتے ہوئے یوں ہی بے خیالی میں بولا۔

”کیا کوئی نئی بات سوچھی۔“ فریدی نے کہا۔

”میں کہتا ہوں آخر دوسری مول لینے سے فائدہ؟ کیوں نہ ہم لوگ اپنی چھٹیاں ہنسی خوشی گزاریں۔“

”اچھا بکواس بند۔“ فریدی جھلا کر بولا۔ ”اگر تم میرا ساتھ نہیں دینا چاہتے تو نہ دو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“

”آپ تو خفا ہو گئے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ بھی اس چھٹی میں ایک آدھ عشق کر لیتے تو اچھا تھا۔“ حمید نے منہ بنا کر کچھ اس انداز میں کہا کہ فریدی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

”اچھا تو کھانا اس وقت میرے ہی ساتھ کھانا۔“ فریدی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”برو چشم.....!“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”بھلا میں اپنے آفسر کا حکم کس طرح ٹال سکتا ہوں۔“

وہ سرکس شروع ہونے سے پندرہ منٹ قبل ہی ریلوے گراؤنڈ پہنچ گئے اور بکس کے دو ٹکٹ لے کر رنگ کے سب سے قریب والے صوفے پر جا بیٹھے۔ دو چار کھیلوں کے بعد اصل کھیل شروع ہوا۔ ایک ٹائٹل قد کا مضبوط نیپالی ایک خوبصورت لڑکی کیساتھ رنگ میں داخل ہوا۔

”غضب کی لوٹیا ہے۔“ حمید نے دھیرے سے کہا۔

”ہشت.....!“ فریدی نیپالی کو بغور دیکھ رہا تھا۔

”خواتین و حضرات.....!“ رنگ لیڈر کی آواز گونجی۔ ”اب دنیا کا خوفناک ترین کھیل شروع ہونے والا ہے۔ یہ لڑکی اس لکڑی کے تختے سے لگ کر لکڑی ہو جائے گی اور یہ نیپالی اپنے خنجر سے لڑکی کے گرد اس کا خاکہ بنائے گا۔ نیپالی کی ذرا سی غلطی یا لڑکی کی خفیف کی جنبش اسے موت کی آغوش میں پہنچا سکتی ہے لیکن دیکھئے کہ یہ لڑکی موت کا مقابلہ کس ہمت سے کرتی ہے اور اس نیپالی کا ہاتھ کتنا سدا ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔“

”کھٹ.....!“ ایک سنسانا ہوا خنجر لڑکی کے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا لکڑی کے تختے میں تین انچ دھنس گیا۔ لڑکی سر سے پیر تک لرز گئی۔ رنگ ماسٹر نے نیپالی کی طرف حیرت سے دیکھا

اور اس کے ہونٹ مضطربانہ انداز میں ہلنے لگے۔ دیکھنے والوں پر سناٹا چھا گیا۔

”کھٹ.....!“ دوسرا خنجر لڑکی کے کانڈھے کے قریب فراک کے لف کو چھدتا ہوا تختے میں دھنس گیا..... لڑکی کا چہرہ دودھ کی طرح سفید نظر آنے لگا۔ رنگ لیڈر نے بے تابانہ رنگ کا چکر لگا ڈالا۔ نیپالی کھڑا دمبر کی سردی میں اپنے چہرے سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔

”کیا اس دن بھی یہ خنجر جسم کے اتنے قریب لگے تھے“ فریدی نے جھک کر حمید سے پوچھا۔

”ہرگز نہیں..... ہرگز نہیں۔“ حمید نے بیتابی سے کہا۔ ”ان کا فاصلہ تین یا چار انچ تھا۔!“

”کھٹ.....!“ اب کی بار لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کے بازو سے خون نکل رہا

تھا۔ فریدی نے نیپالی کو شراپیوں کی طرح لڑکھڑاتے رنگ کے باہر جاتے دیکھا۔ فوراً ہی پانچ چھ جوکروں نے رنگ میں آ کر اچھل کود مچا دی۔

”خواتین و حضرات.....“ رنگ ماسٹر کی آواز گونجی۔ ”مجھے اس واقعہ پر حیرت ہے۔ نیپالی

پندرہ بیس برس سے ہمارے سرکس میں کام کر رہا ہے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا۔ ضرور وہ کچھ بیمار ہے۔ جس کی اطلاع ہمیں نہ تھی۔ بہر حال ابھی بہت سے دلچسپ کھیل باقی ہیں۔“

”آؤ چلیں.....!“ فریدی نے حمید کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

متحدہ دھیموں کے درمیان سے گذرتے ہوئے وہ تھوڑی دیر بعد منیجر کی دفتر کے سامنے پہنچ

گئے۔ فریدی نے چڑا سی سے اپنا ملاقاتی کارڈ اندر بھجوا دیا۔

منیجر اٹھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے پر تپاک لہجے میں بولا۔ ”فرمائیے کیسے تکلیف فرمائی۔“

”میں خنجر والے نیپالی کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”کیا عرض کروں انسپکٹر صاحب..... مجھے خود حیرت ہے۔ آج تک ایسا واقعہ نہیں ہوا۔

مجھے سخت شرمندگی ہے۔ کیا قانوناً مجھے اس کے لئے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں

آتا۔ آج کئی دن سے اس کی حالت بہت ابتر ہے۔ وہ بے حد شراب پینے لگا ہے۔ ہر وقت

نشے میں ڈیگیں مارتا رہتا ہے۔ ابھی کل ہی اپنے ایک ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ میں اب اتنا

دولت مند ہو گیا ہوں۔ مجھے نوکری کی بھی پرواہ نہیں۔ اس نے اسے نوٹوں کی کئی گڈیاں بھی

دکھائی تھیں۔“

”اس کی یہ حالت کب سے ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ راج روپ نگر کے دوران قیام ہی میں اس کی حالت میں تبدیلی واقع ہوتی شروع ہو گئی تھی۔“

”راج روپ نگر.....!“ حمید نے چونک کر کہا۔ لیکن فریدی نے اسکے پیرو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”کیا راج روپ نگر میں بھی آپ کی کہنی نے کھیل دکھائے تھے۔“

”جی نہیں..... وہاں کہاں..... وہ تو ایک قصبہ ہے۔ ہم لوگ وہاں ٹھہر کر اپنے دوسرے قافلے کا انتظار کر رہے تھے۔“

”راج روپ نگر..... وہی تو نہیں جو نواب و جاہت مرزا کی جاگیر ہے۔“

”جی ہاں..... جی ہاں وہی۔“

”کیا یہ نیپالی پڑھا لکھا ہے۔“

”جی ہاں..... میٹرک پاس ہے۔“

”میں اس سے بھی کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور ضرور..... میرے ساتھ چلے۔ لیکن ذرا ہمارا بھی خیال رکھئے گا۔ میں نہیں چاہتا

کہ کہنی کا نام بدنام ہو۔“

”آپ مطمئن رہئے۔“

وہ تینوں خیموں کی قطاروں سے گزرتے ہوئے ایک خیمے کے سامنے رک گئے۔

”اعذر چلے.....!“ فیجر بولا۔

”نہیں صرف آپ چائیے۔ آپ اس سے ہمارے بارے میں کہئے گا۔ اگر وہ ملتا پسند

کرے گا تو ہم لوگ ملیں گے ورنہ نہیں۔“ فریدی نے کہا۔

فیجر پہلے تو کچھ دیر تک حیرت سے اسے دیکھتا رہا پھر اندر چلا گیا۔ فریدی نے اپنی

آنکھیں خیمے کی جالی سے لگا دیں۔ نیپالی ابھی تک کھیل ہی کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ وہ بہت

پریشان نظر آ رہا تھا۔ منیجر کے داخل ہوتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن پھر اس کے چہرے پر قدرے اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔

”اوہ..... آپ ہیں۔ میں سمجھا..... جی کچھ نہیں۔ مجھے سخت شرمندگی ہے۔“ وہ رک رک کر بولا۔

”تو کیا تم کسی اور کا انتظار کر رہے تھے۔“ منیجر نے کہا۔

”جی.....“ وہ ہکھلانے لگا۔ ”نہیں..... بب بالکل نہیں۔“

باہر فریدی نے گہرا سانس لیا اور اسکی آنکھوں میں عجیب قسم کی وحشتانہ چمک پیدا ہو گئی۔

”میں معافی چاہتا ہوں..... مجھے افسوس ہے۔“ نیپالی خود کو سنبھال کر بولا۔

”میں اس وقت اس معاملے پر گفتگو کرنے نہیں آیا ہوں۔“ منیجر بولا۔ ”بات دراصل یہ

ہے کہ ایک صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

نیپالی بڑی طرح کاہنے لگا۔

”مجھ سے مل..... ملنا چاہتے ہیں۔“ وہ بدحواس ہو کر بیٹھتے ہوئے ہکھلایا۔ ”مگر میں نہیں ملتا

چاہتا۔ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔“

”میں بھی بتانے کے لئے ملنا چاہتا ہوں کہ میں کیوں ملنا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے خیمے

میں داخل ہو کر کہا۔ اس کے پیچھے حمید بھی تھا۔

”میں آپ کو نہیں جانتا۔“ اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے

میں آپ سے نہیں ملا۔“

”میں خیر پولیس کا انسپکٹر.....“ فریدی نے جلدی سے کہا۔

”خیر پولیس.....“ وہ اس طرح بولا جیسے کوئی خواب میں بڑبڑاتا ہے۔ ”لیکن

کیوں..... آخر آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔“

”میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن تم اگر میرے سوالات کا صحیح صحیح جواب دو گے تو

پھر تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کیا تم کل رات نشاط مگر ڈاکٹر شوکت کی کوشی پر گئے تھے۔“

فریدی نے یہ جملہ نہایت سادگی اور اطمینان سے ادا کیا۔ لیکن اس کا اثر کسی ہم کے دھماکے سے کم نہ تھا۔ نیپالی بے اختیار اچھل پڑا۔ فریدی کو اب پورا یقین ہو گیا۔

”نہیں نہیں.....!“ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں چیخا۔ ”تم سفید جھوٹ بول رہے ہو..... میں وہاں کیوں جاتا..... نہیں..... یہ جھوٹ ہے..... پکا جھوٹ۔“

”اس سے کوئی فائدہ نہیں مسٹر.....!“ فریدی بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ کل رات تم ڈاکٹر شوکت کو قتل کرنے گئے اور اسکے دھوکے میں سیتا دیوی کو قتل کر آئے۔ اگر تم سچ مچ بتا دو گے تو میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہیں کسی دوسرے نے قتل پر آمادہ کیا تھا۔“

”آپ مجھے بچانے کی کوشش کریں گے۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”اوہ میرے خدا..... میں نے بھیا تک غلطی کی۔“

”شباباش، ہاں آگے کہو۔“ فریدی نرم لہجے میں بولا۔ سرکس کا منجر انہیں حیرت اور خوف کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

نیپالی انسپکٹر فریدی کے اس اچانک حملے سے پہلے ہی سراسیمہ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بے بس بچے کی طرح کہنا شروع کیا..... ”جی ہاں..... میں ضرور بتاؤں گا۔ مگر میں بے قصور ہوں۔ آپ نے کہا کہ میں تمہیں بچالوں گا۔ اس نے مجھے دس ہزار روپے پیشگی دیئے تھے اور قتل کے بعد دس ہزار روپے اور دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اف میں نے کیا کیا..... اس کا نام..... ہاں اس کا نام ہے..... اررر ہا..... اف.....!“ وہ چیخ کر آگے کی طرف جھک گیا۔

”وہ دیکھو.....!“ سرجنٹ حمید چیخا۔

کسی نے خیمے کے پیچھے سے نیپالی پر حملہ کیا تھا۔ خنجر خیمے کے کپڑے کی دیوار پھاڑتا ہوا اس کی پینٹ میں گھس گیا تھا۔ وہ بکس پر بیٹھے بیٹھے دو تین بار تڑپا پھر خنجر کی گرفت سے آزاد ہو کر فرش پر آ رہا۔

”حمید..... باہر..... باہر..... دیکھو جانے نہ پائے۔“ انسپکٹر فریدی غصہ میں چلایا۔

چیخ کی آواز سن کر کچھ اور لوگ بھی آئے۔ سب نے مل کر قاتل کو تلاش کرنا شروع کیا

لیکن بے سود..... فیجر کو گھبراہٹ کی وجہ سے غش آ گیا۔

کو تو اہل اطلاع پہنچا دی گئی..... تھوڑی دیر بعد کئی کانسٹیبل اور دو سب انسپکٹر موقع واردات پر پہنچ گئے۔ انسپکٹر فریدی کو وہاں دیکھ کر انہیں سخت حیرت ہوئی۔ فریدی نے انہیں مختصراً سارا حال بتایا۔ مقتول کے اقرار جرم کا گواہ فیجر تھا لہذا فیجر کا بیان ہو رہا تھا کہ انسپکٹر فریدی اور سرجنٹ حمید وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ان کی کار تیزی سے نشاط نگر کی طرف جارہی تھی۔

”کیوں بھئی رہا نہ وہی..... چھ مہینے والے جاسوسی ناول والا معاملہ۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔
 ”اب تو مجھے بھی دلچسپی ہو چلی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ کو یقین کیونکر ہوا تھا کہ یہی قاتل ہے۔“

”یقین کہاں محض شبہ تھا لیکن فیجر سے گفتگو کرنے کے بعد کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا کہ سازش میں کسی دوسرے کا ہاتھ ضرور تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ قتل کے سلسلے میں اپنی غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد ہی سے اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کھیل کے وقت اس کا ہاتھ بہک رہا تھا اب اسے شاید اس شخص کا انتظار تھا جس نے اسے قتل کے لئے آمادہ کیا تھا۔ اس حماقت کی جوابدہی کے خیال نے اسے اور بھی پریشان کر رکھا تھا۔ انہیں سب چیزوں کو مد نظر رکھ کر میں نے خود پہلے اس کے خیمے میں جانا مناسب نہ سمجھا۔ فیجر کو اندر بھیج کر میں جالی سے اس کا رد عمل دیکھنے لگا۔ جالی سے تو تم بھی دیکھ رہے تھے۔“

”بہر حال آج سے میں آپ کا پورا پورا شاگرد ہو گیا۔“ حمید نے کہا۔

”کیا کہا آج سے..... کیا پہلے نہ تھے۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔

”نہیں پہلے بھی تھا۔“ حمید نے کہا اور دونوں خاموش ہو گئے۔ انسپکٹر فریدی آئندہ کے لئے پروگرام بنارہا تھا۔

پھانک پر کار کی آواز سن کر ڈاکٹر شوکت باہر نکل آیا تھا۔ انسپکٹر فریدی نے سارے واقعات بالتفصیل اسے بتائے۔

”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اب مطمئن ہو جاؤ۔“ فریدی نے شوکت کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا اصل دشمن اب بھی آزاد ہے اور وہ کسی وقت بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ لہذا احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں فکر میں ہوں اور کوشش کروں گا کہ اسے جلد از جلد گرفتار کر کے قانون کے حوالے کر دوں۔“

قاتل کی نئی چال

انسپکٹر فریدی کو افسوس تھا کہ سرکاری طور پر وہ اس کیس کا انچارج نہ ہو سکتا تھا۔ ابھی اس کی چھٹی ختم ہونے میں دو ماہ باقی تھے۔ اسے اس بات کا بھی خیال تھا کہ دوسرے قتل کے بعد سے اس معاملہ میں اس کی دست اندازی کا حال آفیسروں کو ضرور معلوم ہو جائے گا۔ جو اصولاً کسی طرح درست نہ تھا۔ لیکن اسے اس کی پرواہ نہ تھی۔ ملازمت کی پرواہ اسے کبھی تھی اور نہ اب۔ وہ خود بھی صاحب جائیداد اور شان سے زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ اس ملازمت کی طرف اسے دراصل اس کی افتاد طبع لائی تھی۔ ورنہ وہ اتنا دولت مند تھا کہ اس کے بغیر بھی امیروں کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔

دوسری واردات کے دوسرے دن صبح جب وہ سوکر اٹھا تو اسے معلوم ہوا کہ چیف انسپکٹر صاحب کا اردلی عرصہ سے اس کا انتظار کر رہا ہے۔ دریافت حال پر پتہ چلا کہ چیف صاحب اپنے بنگلہ پر بے صبری سے اس کا انتظار کر رہے ہیں اور پولیس انسپکٹر صاحب بھی وہاں موجود ہیں۔ فریدی کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے لا پرواہی سے ناخوشگوار خیالات کو ذہن سے نکال پھینکا اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر چیف صاحب کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

”ہلو فریدی۔“ چیف صاحب نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم لوگ دیر سے

تمہارے منتظر ہیں۔“

”مجھے ذرا دیر ہو گئی۔“ فریدی نے بے پروائی سے کہا۔

”اس وقت ایک اہم معاملے پر گفتگو کرنے کے لئے آپ کو تکلیف دی گئی ہے۔“

پولیس کمشنر نے اپنا سگار کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”شکریہ۔“ فریدی نے سگار لیتے ہوئے کہا۔ ”فرمائیے۔“

”مسٹر فریدی..... چوبیس گھنٹے کے اندر اس علاقے میں دو عدد وارداتیں ہوئی ہیں۔ ان

سے آپ بخوبی واقف ہیں۔“ پولیس کمشنر صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور

آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ تبدیل ہو کر یہاں آئے ہوئے مجھے صرف دس دن ہوئے ہیں۔ ایسی

صورت میں میری بہت بدنامی ہوگی۔ سول پولیس تو قطعی ناکارہ ہے اور معاملہ انتہائی پیچیدہ

ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی بقیہ چھٹی فی الحال کینسل کرالیں اور اس کام میں ذمہ لیتا ہوں

کہ قاتل کا پتہ لگ جانے کے بعد میں آپ کو دو کے بجائے چار ماہ کی چھٹی دلا دوں گا۔ یہ میرا

دوستانہ مشورہ ہے۔ اسے افسری اور ماتحتی سے کوئی تعلق نہیں۔“

”جی میں ہر وقت اور ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔“ فریدی نے اپنی آرزو پوری

ہوتے دیکھ کر پر غلوص لہجے میں کہا۔

”بہت بہت شکریہ۔“ پولیس کمشنر صاحب اطمینان کا سانس لے کر بولے۔ ”کل رات

آپ اپنا بیان دے کر چلے آئے تھے۔ اس کے بعد نیپالی کے خیمے کی تلاشی لینے پر سات ہزار

روپے کے نوٹ برآمد ہوئے۔ جو کم از کم اس کی حیثیت سے زیادہ تھے۔ اس کے پس انداز

ہونے کا خیال اسی لئے پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی آمدنی سے بڑھ کر خرچ کرنے والا آدمی تھا۔

ان روپوں کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی نہ مل سکی جس سے اس کے قاتل کی شخصیت کا پتہ لگ

سکتا۔ بہر حال بیٹا دیوی کے قاتل کے سراغ کا سہرا تو آپ ہی کے سر ہے۔ لیکن اب اس کے

قاتل کے قاتل کا پتہ لگانا بہت ضروری ہے اور یہ کام سوائے آپ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ میں

نے کل رات ہی یہ دونوں کیس ملکہ سراغ رسانی کے سپرد کر دیئے ہیں اب بقیہ ہدایات آپ کو

چیف انسپٹر سے ملیں گی۔“

”اور میں تم کو اس کیس کا انچارج بناتا ہوں۔“ چیف انسپکٹر صاحب نے کہا۔ ”اس کے کاغذات دس بجے تک تمہیں مل جائیں گے۔“

”یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں کیس کی تفتیش شروع ہی سے کر رہا ہوں اور میں نے اس سلسلے میں اپنا طریقہ کار بھی مکمل کر لیا ہے۔ لیکن آپ سے استدعا ہے کہ آپ یہی ظاہر ہونے دیں کہ میں چھٹی پر ہوں اور یہ معاملہ ابھی تک محکمہ سراغ رسانی تک نہیں پہنچا۔“

”تو اس کیس میں بھی تم اپنی پرانی عادت کے مطابق اکیلے ہی کام کرو گے۔“ چیف انسپکٹر پولیس نے کہا۔ ”یہ عادت خطرناک ہے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ بعض وجوہ کی بناء پر جنہیں میں ابھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا مجھے یہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اچھا اب اجازت چاہتا ہوں۔“

انسپکٹر فریدی کے گھر پر سرجنٹ حمید اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ رات بھر نہ سویا ہو۔ فریدی کے گھر پہنچنے ہی وہ بیتابی سے اس کی طرف بڑھا۔ ”کہو..... خیریت تو ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”تم کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہو۔“

کچھ کیا..... میں بہت پریشان ہوں۔“ حمید نے کہا۔

”آ خرابات کیا ہے۔“

”کل رات تقریباً ایک بجے میں آپ کے گھر سے روانہ ہوا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا کوئی پیچھا کر رہا ہے۔ پہلے تو خیال ہوا کہ کوئی راہ گیر ہوگا لیکن جب میں نے اپنا شبہ رفع کرنے کے لئے یوں ہی بے مطلب پیچ در پیچ گلیوں میں گھستا شروع کیا تو میرا شبہ یقین کی حد تک پہنچ گیا کیونکہ وہ اب بھی میرا پیچھا کر رہا تھا۔ خیر میں نے گھر پہنچ کر تالا کھولا اور کواڑ بند کر کے درز سے جھانکتا رہا۔ میرا تعاقب کرنے والا اب میرے مکان کے سامنے کھڑا دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھ گیا۔ میں دبے پاؤں باہر نکلا اور اب میں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس قسم کا تعاقب کم از کم میرے لئے نیا تجربہ تھا کیونکہ تعاقب کرتے کرتے پانچ بج گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ یوں ہی بلا مقصد آوارہ گردی کرتا پھر رہا ہے۔“

مجھے افسوس ہے کہ میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ اس نے اپنے چہرے کا لڑکھڑا کر رکھا تھا اور اس کی ٹائٹ کیپ اس کے چہرے پر جھکی ہوئی تھی۔ تقریباً پانچ بجے وہ بائیں روڈ اور بلی روڈ کے چوراہے پر رک گیا۔ وہاں ایک کار کھڑی تھی۔ وہ اس میں بیٹھ گیا اور کار تیزی سے شمال کی جانب روانہ ہو گئی۔ وہاں اس وقت مجھے کوئی سواری نہ مل سکی۔ لہذا تین میل پیدل چل کر آ رہا ہوں۔ شاید رات سے اب تک میں نے پندرہ میل کا چکر لگایا ہوگا۔“

”تمہاری نئی دریافت تو بہت دلچسپ رہی۔“ فریدی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
 وہ تھوڑی دیر تک تو چپ رہا۔ اسکی آنکھیں اس طرح دھندلا گئیں جیسے اسے نیند آ رہی ہو۔
 پھر اچانک ان میں ایک طرح کی وحشتانہ چمک پیدا ہو گئی اور اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔
 ”کیا کہا تم نے۔“ فریدی بولا۔ ”وہ بائیں روڈ کے چوراہے سے شمال کی جانب چلا گیا۔“
 ”جی ہاں۔“

”اور تمہیں شاید معلوم نہ ہوگا کہ اسی چوراہے پر سے اگر تم جنوب کی طرف چلو تو پندرہ میل چلنے کے بعد تم راج روپ نگر پہنچ جاؤ گے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ مجرم کا سراغ راج روپ نگر ہی میں مل سکے گا۔ دیکھو اگر وہ سچ مچ تمہارا پیچھا کر رہا ہوتا تو تمہیں اس کا احساس تک نہ ہونے دیتا۔ اس نے دیدہ دانستہ ایسا کیا تا کہ تم اس کے پیچھے لگ جاؤ اور وہ اسی چوراہے سے جنوب کی طرف جانے کی بجائے شمال کی طرف جا کر میرے دل سے اس خیال کو نکال دے کہ اصل مجرم راج روپ نگر کا باشندہ ہے۔ اوہ میرے خدا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ نیپالی کے قتل کے پہلے سے ہم لوگوں کے قریب ہی قریب رہا اور اس نے فیجر کے دفتر میں بھی ہماری گفتگو سنی وہیں راج روپ نگر کی گفتگو آئی تھی۔ اخبار میں تو اس کا کوئی حوالہ نہیں تھا..... مجرم معمولی ذہانت کا آدمی نہیں معلوم ہوتا۔ کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتے ہو۔“

”یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔“ حمید نے کچھ سوچ کر کہا۔
 ”لیکن ٹھہریے۔ اس میں ایک خاص بات تھی جس کی بناء پر وہ پہچانا جاسکتا ہے اس کی پیٹھ پر بڑا سا کوڑو تھا۔“

”اماں چھوڑو بھی..... کو بڑ تو کوٹ کے نیچے بہت سا کپڑا ٹھونس کر بھی بتایا جاسکتا ہے۔
 اگر وہ سچ سچ کہتا ہوتا تو تمہیں اپنے پیچھے آنے کی دعوت ہی نہ دیتا۔“
 ”واللہ..... آپ نے تو شر لاک ہو مگر کے بھی کان کاٹ کر کھالئے۔“ حمید نس کر بولا۔
 ”تم نے پھر وہی جاسوسی ناولوں کے جاسوسوں کے حوالے دینے شرع کر دیئے۔“
 فریدی نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”بھندرا میں مضحکہ نہیں اڑا رہا ہوں۔“

”خیر ہٹاؤ..... میں اس وقت تمہارا راج روپ نگر جا رہا ہوں۔“

”یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ آپ تمہارا راج روپ نگر جا رہے ہیں۔ میں رات بھر نہیں سویا۔“
 ”اگر تم سوتے بھی ہوتے تو بھی میں تمہیں اپنے ساتھ نہ لے جاتا کیونکہ تم چھٹی پر ہو اور
 میں نے اپنی چھٹیاں کینسل کرادی ہیں اور یہ کیس سرکاری طور پر میرے سپرد کیا گیا ہے۔“
 ”یہ کب.....!“ حمید نے متحیر ہو کر پوچھا۔

”ابھی.....!“ فریدی نے جواب دیا اور سارے واقعات بتا دیئے۔

”تو پھر واقعی آپ تنہا جائیں گے۔“ حمید نے کہا۔ ”اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ نے اپنا
 طریقہ کار سوچ لیا ہے۔“

”قطعی.....!“ فریدی نے جواب دیا۔ ”کل رات میں نے تمہارے جانے کے بعد ہی
 راج روپ نگر کے متعلق بہت سی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مثلاً یہی کہ راج روپ نگر نواب
 صاحب وجاہت مرزا کی جاگیر ہے اور نواب صاحب کسی شدید قسم کی ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں۔
 مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ تقریباً پندرہ روز سے دن رات سو رہے ہیں یا دوسرے لفظوں میں
 یہ کہنا چاہئے کہ بے ہوش ہیں۔ ان کے فیملی ڈاکٹر کی رائے ہے کہ سر کا آپریشن کرایا جائے لیکن
 موجودہ معالج کرلے تیواری جو پولیس ہسپتال کے انچارج ہیں آپریشن کے خلاف ہیں۔ اس
 سلسلے میں دوسری بات معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ نواب صاحب لا ولد ہیں ان کے ساتھ ان کا
 سوتلا بھتیجا اور ان کی بیوہ بہن اپنی جوان لڑکی سمیت رہتی ہے۔ مجھے جہاں تک پتہ چلا ہے کہ

نواب صاحب نے اپنی جاگیر کے متعلق ابھی تک کسی قسم کا کوئی وصیت نامہ نہیں لکھا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کی بیوہ بہن یا سوتیلے بھتیجے میں سے کوئی بھی جائیداد کے لالچ میں یہ خواہش نہیں رکھ سکتا کہ نواب صاحب ہوش میں آنے سے پہلے ہی مر جائیں۔ بہت ممکن ہے کہ اسی مقصد کے تحت ذہنی بیماریوں کے مشہور ترین ڈاکٹر شوکت کو قتل کر دینے کی کوشش کی گئی ہو محض اس ڈر سے کہ کہیں نواب صاحب اس کے زیر علاج نہ آجائیں کیونکہ ان کا فیملی ڈاکٹر آپریشن پر زور دے رہا تھا۔“ فریدی خاموش ہو گیا۔

”آپ کے دلائل بہت وزنی معلوم ہوتے ہیں۔“ حمید بولا۔ ”لیکن آپ کا تھا جانا ٹھیک نہیں۔“
 ”تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو کہ طریقہ کار سمجھ میں آ جانے کے بعد میں تمہا کام کرنے کا عادی ہوں۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔ ”اور پھر تم نے ابھی حال ہی میں ایک عدد عشق کیا ہے۔ میں تمہارے عشق میں گڑبڑ نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ واپسی میں تمہاری محبوبہ کے لئے ایک عدد انگلیشی ضرور لیتا آؤں گا۔ اچھا اب تم ناشتہ کر کے یہیں سو رہو اور میں چلا۔“

خونفاک بوڑھا

راج روپ نگر میں نواب وجاہت مرزا کی عالی شان کوٹھی بستی سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ نواب صاحب بہت شوقین آدمی تھے۔ اس لئے انہوں نے اس قصبے کو ننھا منا سا خوبصورت شہر بنا دیا تھا۔ بس صرف الیکٹرک لائٹ کی کسر رہ گئی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنی کوٹھی میں ایک طاقتور ڈاکھو لگا کر اس کی کوپرا کر دیا تھا۔ البتہ قصبے والے بجلی کی روشنی سے محروم تھے۔ کوٹھی کے چاروں طرف چار فرلانگ کے رقبہ میں خوشنما باغات اور صاف و شفاف روٹوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ نواب صاحب کی کوٹھی سے ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ایک قدیم وضع کی عمارت تھی جس میں ایک چھوٹا سا مینار تھا۔ کسی زمانے میں اس مینار کا اوپری حصہ کھلا رہا ہوگا اور

نواب صاحب کے آباؤ اجداد اس پر بیٹھ کر تفریح کیا کرتے ہوں گے لیکن اب یہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ صرف دو کھڑکیاں کھلی رہ گئی تھیں۔ ایک کھڑکی میں ایک بڑی سی دور بین لگی ہوئی تھی جس کا قطر تقریباً ایک فٹ رہا ہوگا۔ اس عمارت میں مشہور ماہر فلکیات پروفیسر عمران رہتا تھا۔ نواب صاحب نے یہ پرانی عمارت اسے کرائے پر دے رکھی تھی۔ اس نے اس مینار کی بالائی منزل کو چاروں طرف سے بند کرا کے اس پر اپنی ستاروں کی رفتار کا جائزہ لینے والی بڑی دور بین فٹ کرائی تھی۔ قصبے والوں کے لئے وہ ایک پراسرار آدی تھا۔

بہتوں کا خیال تھا کہ وہ پاگل ہے اسے آج تک کسی نے اس چار فرلانگ کے رقبے سے باہر نہ دیکھا تھا۔

انکیز فریدی کوٹھی کے قریب پہنچ کر سوچنے لگا کہ کس طرح اندر جائے۔ دفعتاً ایک نوکر برآمدے میں آیا۔ فریدی نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔ ”اب نواب صاحب کی کیسی طبیعت ہے۔“ ”ابھی وہی حال ہے۔“ نوکر اسے گھورتا ہوا بولا۔ ”آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔“ ”میں ”روزنامہ خبر“ کا نمائندہ ہوں اور کنور سلیم سے ملنا چاہتا ہوں۔“ ”یہاں اندر ہال میں تشریف لائیے میں انہیں خبر کرتا ہوں۔“

فریدی برآمدے سے گذر کر ہال میں داخل ہوا۔ ہال کی دیواروں پر چاروں طرف نواب صاحب کے آباؤ اجداد کی قد آدم تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ فریدی ان کا جائزہ لیتے لیتے چونک پڑا۔ اس کی نظریں ایک پرانی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔

اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کھنی مونچھوں اور ڈاڑھی کے پیچھے کوئی جانا پہچانا چہرہ ہے۔ ”ارے وہ مارا بیٹا فریدی۔“ وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

وہ قدموں کی آہٹ سے چونک پڑا۔ سامنے کے دروازے میں ایک لمبا ترنگا نوجوان قیمتی سوٹ میں لمبوس کھڑا تھا۔ پہلے تو وہ فریدی کو دیکھ کر جھجکا پھر مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ ”صاحب آپ نامہ نگاروں سے تو میں تنگ آ گیا ہوں۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”کہئے آپ

کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”شاید میں کنور صاحب سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔“ فریدی نے ادب سے کہا۔

”جی ہاں..... مجھے کنور سلیم کہتے ہیں۔“ اس نے بے دلی سے کہا۔ ”جو کچھ پوچھنا ہو جلد پوچھئے۔ میں بہت مشغول آدمی ہوں۔“

”نواب صاحب کا اب کیا حال ہے۔“

”ابھی تک ہوش نہیں آیا..... اور کچھ.....!“

”کب سے بے ہوش ہیں؟“

”پندرہ دن سے..... فیملی ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ آپریشن کیا جائے۔ لیکن کرنل تیواری اس کے حق میں نہیں ہیں۔ اچھا بس اب مجھے اجازت دیجئے۔“ وہ پھر اسی دروازے کی طرف گھوم گیا جس طرف سے آیا تھا۔

فریدی کے لئے واپس جانے کے علاوہ اور چارہ بنی کیا تھا۔

جب وہ پرانی کونٹھی کے پاس سے گزر رہا تھا تو یک بیک اس کی ہیٹ اچھل کر اس کی گود میں آ رہی۔ ہیٹ میں بڑا سا چھید ہو گیا تھا۔ اس نے دل میں کہا ”بال بال بچے فریدی صاحب..... اب کبھی موٹر کی چھت گرا کر سفر نہ کرنا۔ ابھی تو اس بے آواز رائفل نے تمہاری جان ہی لے لی تھی۔“ تھوڑی دور چل کر اس نے کار روک لی اور پرانی کونٹھی کی طرف پیدل واپس لوٹا مہندی کی بازو کی آڑ سے اس نے دیکھا کہ پرانی کونٹھی کے باغ میں ایک عجیب الخلقت بوڑھا ایک چھوٹی نال والی نہایت طاقتور رائفل لئے گلہریوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

فریدی مہندی کی بازو پھلانگ کر اندر پہنچ گیا۔ بوڑھا چونک کر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ بوڑھے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی مردہ قبر سے اٹھ کر آ گیا ہو یا پھر جیسے وہ کوئی بھوت ہو۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا تھا۔ بال کیا بھنویں تک سفید ہو گئی تھیں۔ چہرہ لمبا تھا اور گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ڈاڑھی مونچھ صاف..... ہونٹ اتنے پتلے تھے کہ ان کے درمیان صرف ایک باریک سی گہری لکیر نظر آ رہی تھی۔ لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک اور جسم میں

حیرت انگیز پھر بٹلا پن تھا۔ وہ اچھل کر فریدی کے قریب آ گیا۔

”مجھ سے ملے..... میں پروفیسر عمران ہوں۔ ماہر فلکیات..... اور آپ.....؟“

”مجھے آپ کے نام سے دلچسپی نہیں۔“ فریدی اسے گھور کر بولا۔ ”میں تو اس خوفناک

ہتھیار میں دلچسپی لے رہا ہوں جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

”ہتھیار.....!“ بوڑھے نے خوفناک قہقہہ لگایا۔ ”یہ تو میری دور بین ہے۔“

”وہ دور بین ہی کسی لیکن ابھی اس نے مجھے دوسری دنیا میں پہنچا دیا ہوتا۔“

فریدی نے اپنی ہیٹ کا سوراخ اُسے دکھایا۔ بوڑھے کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔

اس نے ایک بار غور سے رائفل کی طرف دیکھا اور پھر فس کر کہنے لگا۔

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ واقعی رائفل ہی ہے۔ میں گھریوں کا شکار کر رہا تھا۔

معافی چاہتا ہوں اور اپنی دوستی کا ہاتھ آپ کی طرف بڑھاتا ہوں۔“ بوڑھے نے فریدی کا ہاتھ

اپنے ہاتھ میں لے کر اس زور سے دبایا کہ اس کے ہاتھ کی ہڈیاں تک دکھنے لگیں۔ اس نحیف

البدہ بوڑھے میں اتنی طاقت دیکھ کر فریدی بوکھلا سا گیا۔

”آئیے..... اندر چلے..... آپ ایک اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔“ وہ فریدی کا ہاتھ

پکڑے ہوئے پرانی کوشی میں داخل ہوا۔

”آج کل گھریاں اور دوسرے چھوٹے جانور میرا خاص موضوع ہیں۔ آئیے میں آپ کو

ان کے نمونے دکھاؤں۔“ وہ فریدی کو ایک تاریک کمرے میں لے جاتا ہوا بولا۔ کمرے میں

عجیب و غریب طرح کی خوشگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بوڑھے نے کئی موم بتیاں جلائیں کمرے

میں چاروں طرف مردہ جانوروں کے ڈھانچے رکھے ہوئے تھے۔ بہت سے چھوٹے جانور

کیلوں کی مدد سے لکڑی کے تختوں میں جکڑ دیئے گئے تھے۔ ان میں سے کئی خرگوش اور کئی

گھریاں تو ابھی تک زندہ تھیں۔ جن کی تڑپ بہت ہی خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔ کبھی کبھی

کوئی خرگوش درد کی تکلیف سے چیخ اٹھتا تھا۔ فریدی کو اختلاج سا ہونے لگا اور وہ گھبرا کر کمرے

سے نکل آیا۔

”اب آئیے میں آپ کو اپنی آبرو ویری دکھاؤں۔“ یہ کہہ کر وہ مینار کے زینوں پر چڑھنے لگا۔ فریدی بھی اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ مینار تقریباً پچیس فٹ چوڑا رہا ہوگا۔ آخر میں وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے جو بالائی منزل پر تھا۔ وہیں ایک کھڑکی میں دو رہن نصب تھی۔

”یہاں آئیے.....!“ وہ دو رہن کے شیشے پر جھک کر بولا۔ ”میں اس وقت نواب صاحب کی خواہگاہ کا منظر اتنا صاف دیکھ رہا ہوں جیسے وہ یہاں سے صرف پانچ فٹ کے فاصلے پر ہوں۔ نواب صاحب چت لیے ہیں۔ انکے سرہانے انکی بھانجی بیٹھی ہے۔ یہ لیجئے دیکھئے۔“

فریدی نے اپنی آنکھ شیشے سے لگادی۔ سامنے والی کونٹھی کی کشادہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور کمرے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ کوئی شخص سر سے پیر تک مخمل کا لحاف اوڑھے لیٹا تھا اور ایک خوبصورت لڑکی سرہانے بیٹھی تھی۔

”میں سامنے والے کمرے کے بہت سے راز جانتا ہوں۔ لیکن تمہیں کیوں بتاؤں۔“

بوڑھا فریدی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”بس کرو اب آؤ چلیں۔“

”مجھے کسی کے راز جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ فریدی اپنے شانے اچھالتا ہوا بولا۔

بوڑھا قہقہہ لگا کر بولا۔ ”کیا مجھے احمق سمجھتے ہو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ جملہ تم نے محض اسی لئے کہا ہے کہ میں سارے راز اگل دوں۔ تم خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اچھا اب چلو میں تمہیں باہر جانے کا راستہ دکھا دوں۔“

وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ ابھی وہ ہال ہی میں تھے کہ دروازے پر کنور سلیم کی صورت دکھائی دی۔

”آپ یہاں کیسے؟“ اس نے فریدی سے پوچھا۔ ”کیا آپ پروفیسر کو جانتے ہیں۔“

”جی نہیں..... لیکن آج انہیں اس طرح جان گیا ہوں کہ زندگی بھر نہ بھلا سکوں گا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”آپ گھبر یوں کا شکار کرتے کرتے آدمی کا شکار کرنے لگے تھے۔“ فریدی پروفیسر کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”میری ہیٹ ملاحظہ فرمائیے۔“

”اوہ سمجھا.....!“ کنور سلیم تیز لہجے میں بولا۔ ”پروفیسر تم براہ کرم ہماری کوٹھی خالی کر دو ورنہ میں تمہیں پاگل خانے بھجوا دوں گا..... سمجھے۔“

بوڑھے نے خوفزدہ نگاہوں سے کنور سلیم کی طرف دیکھا اور بے ساختہ بھاگ کر میٹار کے زینوں پر چڑھتا چلا گیا۔

”معاف کیجئے گا..... یہ بوڑھا پاگل ہے۔ خواہ مخواہ ہماری پریشانیاں بڑھ جائیں گی۔ اچھا خدا حافظ۔“

گولیوں کی بوچھاڑ

فریدی نے اپنی کار کا رخ قصبے کی طرف پھیر دیا۔ اب وہ نواب کے فیملی ڈاکٹر سے ملنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر توصیف ایک معمر آدمی تھا۔ اس سے قبل وہ سول سرجن تھا۔ پنشن لینے کے بعد اس نے اپنے آبائی مکان میں رہنا شروع کر دیا تھا جو راج روپ نگر میں واقع تھا۔ اس کا شمار قصبہ کے ذی عزت اور دولت مند لوگوں میں ہوتا تھا۔ فریدی کو اس کی جائے رہائش معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

ڈاکٹر توصیف انسپکٹر فریدی کو شاید پہچانتا تھا اس لئے وہ اس کی غیر متوقع آمد سے کچھ گھبرا سا گیا۔

”مجھے فریدی کہتے ہیں۔“ اس نے اپنا ملاقاتی کارڈ پیش کرتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کو جانتا ہوں.....!“ ڈاکٹر توصیف نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”فرمائیے کیسے تکلیف فرمائی۔“

”ڈاکٹر صاحب میں ایک نہایت اہم معاملے میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”فرمائیے..... اچھا اندر تشریف لے چلئے۔“

”آپ ہی نواب صاحب کے فیملی ڈاکٹر ہیں۔“ فریدی نے سگار لائٹر سے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں..... جی..... فرمائیے۔“ ڈاکٹر نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

”کیا کرنل تیواری آپ کے مشورے سے نواب صاحب کا علاج کر رہے ہیں۔“ وہ

اچانک پوچھ بیٹھا۔

ڈاکٹر توصیف چونک کر اسے گھورنے لگا۔

”لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”ڈاکٹر صاحب! ذہنی بیماریوں کے علاج میں مجھے تھوڑا سا دخل ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس قسم کے امراض کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے آپریشن..... آخر یہ کرنل تیواری قلعہ اوقات کیوں کر رہے ہیں اور یہ چیز بھی ہمارے لئے باعث تشویش ہے کہ کرنل تیواری کو جسے کئی نوجوان ڈاکٹر امراض کے سلسلے میں کافی پیچھے چھوڑ چکے ہیں معالج کیوں مقرر کیا گیا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ ایک قطعی نجی معاملے میں داخل اندازی کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر توصیف نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”آپ سمجھے نہیں۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں نواب صاحب کی جان لینے کی ایک گہری سازش کا پتہ لگا رہا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ سے مدد لینی مناسب ہے۔“

”جی.....!“ ڈاکٹر توصیف نے چونک کر کہا اور پھر مضطرب سا ہو گیا۔

”جی ہاں..... کیا آپ میری مدد کریں گے۔“ فریدی نے سگار کا کش لے کر پراطمینان لہجے میں کہا۔

”بات دراصل یہ ہے انسپکٹر صاحب کہ میں خود بھی اس معاملے میں بہت پریشان ہوں۔

لیکن کیا کروں..... خود نواب صاحب کی بھی یہی خواہش تھی۔ انہیں دو ایک بار کرنل تیواری کے علاج سے فائدہ ہو چکا ہے۔“

”لیکن مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ کرنل تیواری کو علاج کے لئے ان کے خاندان والوں نے منتخب کیا ہے۔“

”نہیں یہ بات نہیں۔ البتہ انہوں نے میری آپریشن والی تجویز نہیں مانی تھی۔ میں آپ کو وہ خط دکھاتا ہوں جو نواب صاحب نے دورہ پڑنے سے ایک دن قبل مجھے لکھا تھا۔“

”ڈاکٹر توصیف اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور فریدی سگار کے کش لیتا ہوا ادھ کھلی آنکھوں سے غلام میں تاکتا رہا۔

”یہ دیکھئے نواب صاحب کا خط.....!“ ڈاکٹر توصیف نے فریدی کی طرف خط بڑھاتے ہوئے کہا۔ فریدی خط کا جائزہ لینے لگا۔ خط نواب زادہ صاحب کے ذاتی پیڈ کے کاغذ پر لکھا گیا تھا جس کی پیشانی پر ان کا نام اور پتہ چھپا ہوا تھا۔

فریدی خط پڑھنے لگا۔

”ذیئر ڈاکٹر.....“

آج دو دن سے مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے مجھ پر دورہ پڑنے والا ہے۔ اگر آپ شام تک کرنل تیواری کو لے کر آجائیں تو بہتر ہے کچھلی مرتبہ بھی ان کے علاج سے فائدہ ہوا تھا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کرنل تیواری آج کل بہت مشغول ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ انہیں لے کر ہی آئیں گے۔

آپ کا

وجاہت مرزا۔

”ڈاکٹر صاحب کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ خط نواب صاحب ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔“ فریدی نے خط پڑھ کر کہا۔

”اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ اس پر اس وقت میں آپ سے گفتگو کر رہا ہوں۔ میں نواب صاحب کا انداز تحریر لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں۔“

”ہوں.....!“ فریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ڈاکٹر صاحب ذرا اس پر غور کیجئے

کیا آپ نے کبھی اتنی چوڑائی رکھنے والے کاغذ کا اتنا چھوٹا پیڑ بھی دیکھا ہے۔ کی قدر بے ڈھنگا معلوم ہو رہا ہے۔ اوہ..... یہ دیکھئے..... صاف معلوم ہوتا ہے کہ دستخط کے نیچے سے کسی نے کاغذ کا بقیہ کھڑا قینچی سے کاٹا ہے۔ ڈاکٹر کیا آپ کو یہ اسی حالت میں ملا تھا۔“

”جی ہاں.....!“ ڈاکٹر نے متحیر ہو کر کہا۔ ”لیکن میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”وہی عرض کرنے جا رہا ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ نواب صاحب نے خط لکھا کر دستخط کر دینے کے بعد بھی نیچے لکھا ہو جسے کسی نے بعد میں قینچی سے کاٹ کر اسے برابر کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ نواب صاحب فطرتاً سے کنجوس نہیں کہ باقی بچا ہوا کاغذ کاٹ کر دوسرے مصرف کے لئے رکھ لیں۔“

”اُف میرے خدا۔“ ڈاکٹر نے سر پکڑ لیا۔ ”یہاں تک میری نظر نہیں پہنچی تھی۔“

”بہر حال حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں کیا آپ بحیثیت فیملی ڈاکٹر اتنا نہیں کر سکتے کہ کرنل تیواری کی بچائے کسی اور معاملے سے علاج کرائیں۔“

”میں اس معاملے میں بالکل بے بس ہوں فریدی صاحب۔ حالانکہ نواب صاحب نے کئی بار مجھ سے آپریشن کے متعلق گفتگو کی تھی..... اور ہاں کیا نام ہے اس کا اس سلسلے میں سول ہسپتال کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر شوکت کا بھی تذکرہ آیا تھا۔“

”کب تو معاملہ بالکل صاف ہو گیا۔“ فریدی نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے خط لکھ چکنے کے بعد نواب صاحب نے یہ لکھا ہو کہ اگر کرنل تیواری نہ مل سکیں تو ڈاکٹر شوکت کو لیتے آئیے گا۔ اس حصے کو کسی نے غائب کر دیا۔“

”ہوں.....!“ توصیف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ ڈاکٹر شوکت سے ضرور رجوع کیجئے۔ کم از کم اس صوبے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتا۔“

”میں اس کی تعریفیں اخبارات میں پڑھتا رہتا ہوں اور اس سے ایک بار مل بھی چکا ہوں۔ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ نواب صاحب کا سو فیصدی کامیاب آپریشن کرے گا

لیکن فریدی صاحب میں کرٹل تیواری کی موجودگی میں بالکل بے بس ہوں۔ ایسا جھکی آدمی تو آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔“

”کرٹل تیواری کی آپ فکر نہ کریں، اس کا انتظام میں کر لوں گا۔ آپ جتنی جلد ممکن ہو سکے ڈاکٹر شوکت سے مل کر معاملات طے کر لیجئے۔“

”آپ کرٹل تیواری کا کیا انتظام کریں گے۔“

”انتظام کرنا کیسا! وہ تو قریب قریب ہو چکا ہے۔“ فریدی نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”تین دن کے بعد کرٹل تیواری کا یہاں سے تبادلہ ہو جائے گا۔ اوپر سے حکم آ گیا ہے۔ مجھے باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے۔ لیکن خود کرٹل تیواری کو ابھی تک اس کا علم نہیں۔ انہیں اتنی جلد جانا ہوگا کہ شاید وہ دھوبی کے یہاں سے اپنے کپڑے بھی نہ منگا سکیں۔ لیکن یہ راز کی بات ہے اسے اپنے تک محدود رکھئے گا۔“

”ارے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔“ ڈاکٹر توصیف نے کہا۔

”اچھا تو اب میں چلوں..... آپ کرٹل تیواری کے تبادلے کی خبر سننے ہی ڈاکٹر شوکت کو یہاں لے آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت پھر کسی کو اعتراض کی بھی گنجائش نہ رہ جائے گی۔ ہاں دیکھئے اس کا خیال رہے کہ میری ملاقات کا حال کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ خصوصاً نواب صاحب کے خاندان کے کسی فرد اور اس خطی بوڑھے پروفیسر کو اس کی اطلاع نہ ہونے پائے۔ صاحب مجھے تو وہ بوڑھا انتہائی خبیث معلوم ہوتا ہے۔“

”میں بھی اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا.....!“

”وہ آخر ہے کون۔“ فریدی نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال سے وہ نواب صاحب کا کوئی عزیز ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ نواب صاحب نے میرے ہی سامنے اس سے پرانی کٹھی کا کرایہ نامہ لکھوایا تھا۔ بلکہ میں نے اس پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کئے تھے۔“

”خیر..... اچھا اب میں اجازت چاہوں گا۔“ فریدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ جلد ہی ڈاکٹر شوکت سے ملاقات کریں گے۔“

فریدی کی کار تیزی سے شہر کی طرف جارہی تھی۔ آج اس کا دماغ بے انتہا الجھا ہوا تھا۔ بہر حال وہ جو مقصد لے کر راج روپ نگر آیا تھا اس میں اگر بالکل نہیں تو تھوڑی بہت کامیابی ضرور ہوئی تھی۔ اب وہ آئندہ کے لئے پروگرام مرتب کر رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ سوچتا تھا اسے اپنی کامیابی پر پورا یقین ہوتا جا رہا تھا۔

سڑک کے دونوں طرف دور دور تک چھپول کی کھنی جھاڑیاں تھیں۔ سڑک بالکل سنان تھی۔ ایک جگہ اسے سچ سڑک پر ایک خالی تانگہ کھڑا نظر آیا۔ وہ بھی اس طرح جیسے وہ خاص طور پر راستہ روکنے کے لئے کھڑا کیا گیا ہو۔ فریدی نے کار کی رفتار دھبی کر کے ہارن دینا شروع کیا لیکن دور و نزدیک کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ سڑک زیادہ چوڑی نہ تھی۔ لہذا فریدی کو کار روک کر اترنا پڑا۔ تانگہ کنارے لگا کر وہ گاڑی کی طرف لوٹ ہی رہا تھا کہ اسے دور جھاڑیوں میں ایک بھیا نک چیخ سنائی دی۔ کوئی بھرائی ہوئی آواز میں چیخ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بار بار چیخنے والے کا منہ دبایا جاتا ہو اور وہ گرفت سے نکلنے کے بعد پھر چیخنے لگتا ہو۔ فریدی نے جیب سے ریوالت نکال کر آواز کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ وہ قد آدم جھاڑیوں سے الجھتا ہوا گرنا پڑنا جنگل میں گھسا جا رہا تھا۔ دفعتاً ایک فائر ہوا اور ایک گولی سنناتی ہوئی اس کے کانوں کے قریب سے نکل گئی۔ وہ پھرتی کے ساتھ زمین پر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے رہنٹکا ہوا وہ ایک کھائی کی آڑ میں ہو گیا۔ اب پے درپے فائر ہونے شروع ہو گئے۔ اس نے بھی اپنا پستول خالی کرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف سے فائر ہونے بند ہو گئے۔ شاید گولیاں چلانے والا اپنے خالی پستول میں کار تو سچا رہا تھا۔ فریدی نے کھائی کی آڑ سے سر ابھارا ہی تھا کہ فائر ہوا۔ اگر وہ تیزی سے پیچھے کی طرف نہ گر گیا ہوتا تو کھوپڑی اڑی گئی تھی۔ دوسری طرف سے پھر اندھا دھند فائر ہونے لگے۔ فریدی نے بھی دو تین فائر کئے اور پھر چیخا کراہتا سڑک کی طرف بھاگا۔ دوسری طرف سے اب بھی فائر ہو رہے تھے۔ لیکن وہ گرنا پڑنا بھاگا جا رہا تھا۔ کار میں پہنچنے ہی وہ تیز

رفتاری سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

حیرت ناک سانحہ

شام کا اخبار شائع ہوتے ہی سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ اخبار والے گلی کوچوں میں چیختے پھر رہے تھے انسپکٹر فریدی کا قتل..... ایک ہفتہ کے اندر اندر آپ کے شہر میں تین قتل..... شام کا تازہ پرچہ پڑھئے۔ اخبار میں پورا واقعہ درج تھا۔

آج دو بجے دن انسپکٹر فریدی کی کار پولیس ہسپتال کی کپاؤٹ میں داخل ہوئی۔ انسپکٹر فریدی کار سے اترتے وقت لڑکھڑا کر گر پڑے۔ کسی نے ان کے داہنے بازو اور بائیں شانے کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا تھا۔ فوراً ہی طبی امداد پہنچائی گئی لیکن فریدی صاحب جان بر نہ ہو سکے۔ تین گھنٹے موت و حیات کی کش مکش میں جتلارہ کر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ یقیناً یہ ملک و قوم کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔

انسپکٹر فریدی غالباً سیتا دیوی کے قتل کے سلسلے میں تعینات کر رہے تھے لیکن انہوں نے اپنے سرکاری روزنامے میں کسی کی کوئی خانہ پری نہیں کی۔ چیف انسپکٹر صاحب کو بھی اس بات کا علم نہیں کہ انہوں نے سراغ رسانی کا کون سا طریقہ اختیار کیا تھا۔ ابھی تک کوئی نہیں بتا سکا کہ انسپکٹر فریدی آج صبح کہاں گئے تھے۔ بظاہر ان کی کار پر جمی ہوئی گرد اور پھپھوں کی حالت بتاتی ہے کہ انہوں نے کافی لمبا سفر کیا تھا۔

”انسپکٹر فریدی کی عمر تیس سال تھی۔ وہ غیر شادی شدہ تھے۔ انہوں نے دو بچے اور ایک بڑی جائیداد چھوڑی ہے۔ ان کے کسی وارث کا پتہ نہیں چل سکا۔“

یہ خبر آگ کی طرح آنا فانا سارے شہر میں پھیل گئی۔ محکمہ سراغ رسانی کے دفتر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ انسپکٹر فریدی کے دوستوں نے لاش حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں لاش

دیکھنے تک کی اجازت نہ دی گئی اور کئی خبروں سے معلوم ہوا کہ پوسٹ مارٹم کرنے پر پانچ یا چھ زخم پائے گئے ہیں۔“

یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن سر جٹ حمید نہ جانے کیوں چپ تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ انسپکٹر فریدی راج روپ نگر گیا تھا لیکن اس نے اس کی کوئی اطلاع چیف انسپکٹر کو نہ دی۔ وہ نہایت اطمینان سے پولیس اور خفیہ پولیس کی بھاگ دوڑ کا جائزہ لے رہا تھا۔

دوسرے جاسوسوں اور بھتیجے لوگوں نے اس سے ہر طرح پوچھا لیکن اس نے ایک کو بھی کوئی تشفی بخش جواب نہ دیا۔ کسی سے کہتا کہ انہوں نے مجھے اپنا پروگرام نہیں بتایا تھا کسی سے کہتا انہوں نے مجھ سے یہ تک تو بتایا نہیں تھا کہ انہوں نے اپنی چھٹی کینسل کرا دی ہے پھر سراغ رسانی کا پروگرام کیا بتاتے۔ کسی کو یہ جواب دیتا کہ وہ اپنی ایکسوں میں کسی سے نہ مشورہ لیتے تھے اور نہ مل کر کام کرتے تھے۔

تقریباً دس بجے رات کو ایک اچھی حیثیت کا نیپالی چوروں کی طرح چھپتا چھپاتا سر جٹ حمید کے گھر سے نکلا۔ بڑی دیر تک یوں ہی بے مصرف سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا پھر ایک گھٹیا سے شراب خانے میں کھس گیا۔ جب وہ وہاں سے نکلا تو اسکے پیر بڑی طرح ڈگمگا رہے تھے۔ آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کثرت سے پی گیا ہو۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ٹیکسیوں کی طرف چل پڑا۔

”دل بھائی شاپ ہم دور جانا ملتا ہے۔“ اس نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

”صاحب ہمیں فرصت نہیں.....!“ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

”او بابا پیسہ دے گا.....“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... نہیں صاحب..... مجھے فرصت نہیں۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے دوسری طرف منہ

پھرتے ہوئے کہا۔

”ارے لو ہمارا باپ..... تم بھی شالا کیا یاد کرے گا۔“ اس نے دس دس کے تین نوٹ اس

کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب چلے گا ہمارا باپ۔“

”بیٹھے کہاں چلنا ہوگا۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”جاؤ ہم نہیں جانا مانگتا..... ہم تم کو تمیں روپیہ خیرات دیا۔“ اس نے روٹھ کر زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں صاحب اٹھئے چلئے..... جہاں آپ کہیں آپ کو پہنچا دوں۔ چاہے جہنم ہی کیوں نہ ہو۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے اس کے فٹے کی حالت سے لطف اٹھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

”جہنم لے چلے گا۔“ نیپالی نے اٹھ کر پرسرت لہجے میں کہا۔ ”تم بڑا اچھا ہے۔ تم ہمارا باپ ہے..... تم ہمارا بھائی ہے..... تم ہمارا ماں ہے..... تم ہمارا بی بی ہے..... تم ہمارا بی بی کا شالا ہے..... تم ہمارا..... تم ہمارا..... تم ہمارا کیا ہے۔“

”صاحب ہم تمہارے سب کچھ ہے بولو کہاں چلے گا۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے اس کا ہاتھ اپنی گردن سے ہٹا کر ہتے ہوئے کہا۔

”جدھر ہم بتانا مانگتا۔ شالا تم نہیں جانتا کہ ہم بڑا لوگ ہے۔ ہم تم کو اور بخشیش دیگا۔“ مدہوش نیپالی نے کچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”شیدھا چلو۔“

دوسرے موڑ پر پہنچ کر ٹیکسی راج روپ نگر کی طرف جارہی تھی۔

کتے کی موت

ڈاکٹر شوکت انسپکٹر فریدی کی موت کی خبر سن کر ششدر رہ گیا۔ اسے حیرت تھی کہ آخریک بیک یہ کیا ہو گیا۔ لیکن وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس کی موت سیٹا دیوی قتل کی تفتیش کے سلسلے میں واقع ہوئی ہے۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ فریدی کے کسی پرانے دشمن نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا۔ محکمہ سراغ رسانی والوں کے لئے دشمنوں کی اچھی خاصی تعداد پیدا کر لینا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس پیشے کے کامیاب ترین آدمیوں کی موتیں عموماً اسی طرح واقع ہوتی ہیں۔“

سیتا دیوی کے قتل کے متعلق اس کی اب تک بھی رائے تھی کہ یہ کام ان کے کسی ہم مذہب کا ہے۔ جس نے مذہبی جذبات سے اندھا ہو کر آخر کار انہیں قتل ہی کر دیا۔ انسپکٹر فریدی کا یہ خیال کہ وہ حملہ دراصل اسی پر تھا رفتہ رفتہ اسکے ذہن سے ہٹا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اسے راج روپ نگر سے ڈاکٹر توصیف کا خط ملا تو اس نے اس قصبے کے نام پر دھیان تک نہ دیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر توصیف خود اس سے ملنے کے لئے آیا۔ اس نے نواب صاحب کے مرض کی ساری تفصیلات بتا کر اسے آپریشن کرنے پر آمادہ کر لیا۔

ڈاکٹر شوکت کی کار راج روپ نگر کی طرف جارہی تھی۔ وہ اپنے اسٹنٹ اور دو نرسوں کو ہدایت کرا رہا تھا کہ وہ چار بجے تک آپریشن کا ضروری سامان لے کر راج روپ نگر پہنچ جائیں۔ نواب صاحب کے خاندان والے ابھی تک کرنل تیواری کے تبادلے اور توصیف کے نئے فیصلے سے ناواقف تھے۔ ڈاکٹر شوکت کی آمد سے وہ سب حیرت میں پڑ گئے۔ خصوصاً نواب صاحب کی بہن تو آپے سے باہر ہو گئیں۔

”ڈاکٹر صاحب.....!“ وہ توصیف سے بولیں۔ ”میں آپ کی اس حرکت کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔“

”مہترمہ مجھے افسوس ہے کہ مجھے آپ سے مشورے کی ضرورت نہیں۔“ توصیف نے لاپرواہی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ نواب صاحب کی بہن نے حیرت اور غصہ کے ملے جلے انداز میں کہا۔ ”مطلب یہ کہ اچانک کرنل تیواری کا تبادلہ ہو گیا ہے اور اب اس کے علاوہ کوئی اور صورت باقی نہیں رہ گئی۔“

”کرنل تیواری کا تبادلہ ہو گیا ہے۔“

”ان کا خط ملاحظہ فرمائیے۔“ ڈاکٹر توصیف نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر ان کے سامنے ڈال دیا۔ وہ خط پڑھنے لگیں۔ کنور سلیم اور نواب صاحب کی بھانجی نجمہ بھی جھک کر دیکھنے لگیں۔

”لیکن میں آپریشن تو ہرگز نہ ہونے دوں گی۔“ بیگم صاحبہ نے خط واپس کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے محترمہ..... یہاں آپ کی رائے کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا۔ نواب صاحب کے طبی مشیر ہونے کی حیثیت سے اس کی سو فیصدی ذمہ داری مجھ پر عاید ہوتی ہے۔ کرل تیواری کی عدم موجودگی میں میں قانوناً اپنے حق کو استعمال کر سکتا ہوں۔“

”قطعی..... قطعی..... ڈاکٹر صاحب۔“ کنور سلیم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر ڈاکٹر شوکت میرے چچا کو اس مہلک مرض سے نجات دلا دیں تو اس سے بڑھ کر اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ اب آپریشن کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔“

”سلیم.....!“ نواب صاحب کی بہن نے گرج کر کہا۔

”پھوپھی صاحبہ..... میں سمجھتا ہوں کہ آپ ایک محبت کرنے والی بہن کا دل رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی صحت کی خاطر دل پر پتھر رکھنا ہی پڑے گا۔“

”کنور بھیا..... آپ اتنی جلد بدل گئے۔“ نجمہ نے کہا۔

”کیا کروں نجمہ..... اگر کرل تیواری موجود ہوتے تو میں کبھی آپریشن کے لئے تیار نہ ہوتا۔ لیکن ایسی صورت میں۔ تہی بناؤ چچا جان کب تک یونہی پڑے رہیں گے۔“

”کیوں صاحب کیا آپریشن کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی؟“ نواب صاحب کی بہن نے ڈاکٹر شوکت سے پوچھا۔

”یہ تو میں مریض کو دیکھنے کے بعد ہی بتا سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر شوکت نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں ہاں ممکن ہے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے۔“ ڈاکٹر توصیف نے کہا۔

نواب صاحب جس کمرے میں تھے وہ اوپری منزل میں واقع تھا۔ سب لوگ نواب صاحب کے کمرے میں آئے۔ وہ کبل اوڑھے چت لیٹے ہوئے تھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ گہری نیند میں ہوں۔

ڈاکٹر شوکت اپنے آلات کی مدد سے ان کا معائنہ کرتا رہا۔

”مجھے افسوس ہے بیگم صاحبہ کہ آپریشن کے بغیر کام نہ چلے گا۔“ ڈاکٹر شوکت نے اپنے

آلات کو ہینڈ بیک میں رکھتے ہوئے کہا۔
پھر سب لوگ نیچے واپس آ گئے۔

ڈاکٹر شوکت نے نواب صاحب کے خاندان والوں کو کافی اطمینان دلایا۔ ان کی تشفی کے لئے اس نے ان لوگوں کو اپنے بے شمار خطرناک کیسوں کے حالات سنا ڈالے۔ نواب صاحب کا آپریشن تو ان کے مقابلہ میں کوئی چیز نہ تھا۔

”پھوپھی صاحبہ آپ نہیں جانتیں۔“ بیگم صاحبہ سے سلیم نے کہا۔ ”ڈاکٹر شوکت صاحب کا ٹانی پورے ہندوستان میں نہیں مل سکتا۔“
”میں کس قابل ہوں۔“ ڈاکٹر شوکت نے خاکسارانہ انداز میں کہا۔ ”سب خدا کی مہربانی اور اس کا احسان ہے۔“

”ہاں یہ تو بتائیے کہ آپریشن سے قبل کوئی دوا وغیرہ دی جائے گی۔“ کنور سلیم نے پوچھا۔
”نی الحال ایک انجکشن دوں گا۔“

”اور آپریشن کب ہوگا۔“ نواب صاحب کی بہن نے پوچھا۔

”آج ہی..... آٹھ بجے رات سے آپریشن شروع ہو جائے گا۔ چار بجے تک میرا اسٹنٹ اور دو نرسیں یہاں آ جائیں گی۔“

”میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔“ نواب صاحب کی بھانجی نے کہا۔

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔ ”میں اپنی ساری کوششیں صرف کر دوں گا۔ کیس کچھ ایسا خطرناک نہیں۔ خدا تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ آپریشن کامیاب ہوگا۔ آپ لوگ قطعی پریشان نہ ہوں۔“

”ڈاکٹر صاحب آپ اطمینان سے اپنی تیاری مکمل کیجئے۔“ کنور سلیم ہنس کر بولا۔

”بیچاری عورتوں کے بس میں گھبرانے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔“

نواب صاحب کی بہن نے اسے تیز نظروں سے دیکھا اور نجمہ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

”میرا مطلب ہے پھوپھی صاحبہ کہ کہیں ڈاکٹر صاحب آپ لوگوں کی حالت دیکھ کر

بدل نہ ہو جائیں۔ اب چچا جان کو اچھا ہی ہو جانا چاہئے۔ کوئی حد ہے اٹھارہ دن ہو گئے ابھی تک بے ہوشی زائل نہیں ہوئی۔“

”تم اس طرح کہہ رہے ہو گویا ہم لوگ انہیں صحت مند دیکھنے کے خواہش مند نہیں ہیں!“ بیگم صاحبہ نے منہ بنا کر کہا۔

”خیر..... خیر.....!“ فیلی ڈاکٹر توصیف نے کہا۔ ”ہاں تو ڈاکٹر شوکت میرے خیال سے اب آپ انجکشن دے دیجئے۔“

ڈاکٹر شوکت، ڈاکٹر توصیف اور کنور سلیم بالائی منزل پر مریض کے کمرے میں چلے گئے اور دونوں ماں بیٹیاں ہال ہی میں رک کر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ نجمہ کچھ کہہ رہی تھی اور نواب صاحبہ کی بہن کے ماتھے پر شکنیں ابھر رہی تھیں۔ انہوں نے دو تین بار زینے کی طرف دیکھا اور باہر نکل گئیں۔

انجکشن سے فارغ ہو کر ڈاکٹر شوکت، کنور سلیم اور ڈاکٹر توصیف کے ہمراہ باہر آیا۔

”اچھا کنور صاحب اب ہم لوگ چلیں گے۔ چار بجے تک نرسیں اور میرا اسٹنٹ آپ کے یہاں آ جائیں گے اور میں بھی ٹھیک چھ بجے یہاں پہنچ جاؤں گا۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

”تو یہیں قیام کیجئے نا.....!“ سلیم نے کہا۔

”نہیں..... ڈاکٹر توصیف کے یہاں ٹھیک رہے گا اور پھر قصبے میں مجھے کچھ کام بھی ہے۔“

”ہم لوگ چھ بجے تک یقیناً آ جائیں گے۔“

ڈاکٹر کار میں بیٹھ گئے لیکن ڈاکٹر شوکت کی پے در پے کوششوں کے باوجود بھی کار

اشارت نہ ہوئی۔

”یہ تو بڑی مصیبت ہوئی۔“ ڈاکٹر شوکت نے کار سے اتر کر مشین کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”فکرمات کیجئے..... میں اپنی گاڑی نکال کر لاتا ہوں۔“ کنور سلیم نے کہا اور لمبے ڈگ

بھرتا ہوا گیراج کی طرف چلا گیا۔ جو پرانی کٹھی کے قریب واقع تھا۔

تھوڑی دیر بعد نواب صاحبہ کی بہن آ گئیں۔

”ڈاکٹر شوکت کی کار خراب ہوگئی۔ کنور صاحب کار کے لئے گئے ہیں۔“ ڈاکٹر توصیف نے ان سے کہا۔

”اوہ..... کار تو میں نے ہی شہر بھیج دی ہے اور بھائی جان والی کار عرصہ سے خراب ہے۔“
 ”اچھا تو پھر آئیے ڈاکٹر صاحب ہم لوگ پیدل ہی چلیں..... صرف ڈیڑھ میل تو چلنا ہے۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

”ڈاکٹر توصیف! مجھے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔“ نواب صاحب کی بہن نے کہا۔
 ”اگر آپ لوگ شام تک یہیں ٹھہریں تو کیا مضائقہ ہے۔“

”بات دراصل یہ ہے کہ مجھے چند ضروری تیاریاں کرنی ہیں۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔
 ”ڈاکٹر صاحب کو آپ روک لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

”آپ کچھ خیال نہ کیجئے.....!“ نیگم صاحبہ بولیں۔ ”اگر کار شام تک واپس آگئی تو میں چھ بجے تک بھجوا دوں گی۔ ورنہ پھر کسی دوسری سواری کا انتظام کیا جائے گا۔“

”شام کو تو میں ہر صورت میں پیدل ہی آؤں گا۔ کیونکہ آپریشن کے وقت میں کافی چاق و چوبند رہنا چاہتا ہوں۔“ شوکت نے کہا اور قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راہ میں کنور سلیم ملا۔

”مجھے افسوس ہے ڈاکٹر کہ اس وقت کار موجود نہیں۔ آپ یہیں رہئے آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔“

”حرج تو کوئی نہیں لیکن مجھے تیاری کرنی ہے۔“ ڈاکٹر شوکت نے جواب دیا۔

”اچھا تو چلے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔“

”نہیں..... شکریہ..... راستہ میرا دیکھا ہوا ہے۔“

ڈاکٹر شوکت جیسے ہی پرانی کٹھی کے قریب پہنچا اسے ایک عجیب قسم کا وحشیانہ قہقہہ سنائی دیا۔ عجیب اقلقت بوڑھا پروفسر عمران قہقہے لگاتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ہیلو ہیلو.....!“ بوڑھا چیخا۔ ”اپنے مکان کے قریب اجنبیوں کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی

ہے۔“

ڈاکٹر شوکت رک گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اسکے جسم کے سارے روئیں کھڑے ہو گئے ہوں۔ اتنی خوفناک شکل کا آدمی آج تک اس کی نظروں سے نہ گذرا تھا۔

”مجھ سے ملنے..... میں پروفیسر عمران ہوں۔“ اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ.....!“

”مجھے شوکت کہتے ہیں.....!“ شوکت نے بادل خواستہ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ ہاتھ ملاتے وقت بوڑھا کچھ ست پڑ گیا تھا۔ بوڑھے نے فوراً ہی اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور قبضہ لگاتا، اچھلتا کودتا پھر پرانی کوٹھی میں واپس چلا گیا۔

ڈاکٹر شوکت متحیر کھڑا تھا۔ دفعتاً قریب کی جھاڑیوں سے ایک بڑا سا کتا اس پر جھپٹا۔ ڈاکٹر شوکت گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کتے نے جست لگائی اور ایک بھیاںک چیخ کے ساتھ زمین پر آ رہا۔ چند سیکنڈ تک وہ تڑپا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ ڈاکٹر شوکت کو کچھ سوچنے بچھنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے بعد کچھ سمجھ ہی میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”ارے یہ میرے کتے کو کیا ہوا..... ٹائیگر ٹائیگر.....!“ ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ شوکت چونک پڑا۔ سامنے نواب صاحب کی بھانجی نجمہ کھڑی تھی۔

”مجھے خود حیرت ہے۔“ شوکت نے کہا۔

”میں نے اس کے غرانے کی آواز سنی تھی۔ کیا یہ آپ پر جھپٹا تھا لیکن اس کی سزا موت تو نہ ہو سکتی تھی۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”یقین فرمائیے محترمہ مجھے خود حیرت ہے کہ اسے یک بیک ہو کیا گیا..... اگر آپ کو مجھ پر شبہ ہے تو بھلا بتائیے میں نے اسے کیونکر مارا.....؟“

نجمہ کتے کی لاش پر جھکی اسے پکار رہی تھی۔ ”ٹائیگر ٹائیگر.....!“

”بے سود ہے محترمہ یہ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔“ شوکت کتے کی لاش کو ہلاتے ہوئے بولا۔

”آخر اسے ہو کیا گیا۔“ نجمہ نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔

”میں خود بھی سوچ رہا ہوں۔ بظاہر کوئی زخم بھی نہیں نظر آیا۔“

”سخت حیرت ہے۔۔۔۔۔!“

دفعتاً ڈاکٹر شوکت کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا۔ وہ اسکے بچوں کا معائنہ کرنے لگا۔

”اوہ۔۔۔۔۔!“ اس کے منہ سے حیرت کی چیخ نکلی اور اس نے کتے کے پنچے میں چھبی ہوئی

گراموفون کی ایک سوئی کھینچ لی اور حیرت سے اسے دیر تک دیکھتا رہا۔

”دیکھئے محترمہ غالباً یہ زہریلی سوئی ہی آپ کے کتے کی موت کا سبب بنی ہے۔“

”سوئی۔۔۔۔۔!“ نجمہ نے چونک کر کہا۔ ”گراموفون کی سوئی۔۔۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔۔۔!“

”مطلب تو میں بھی نہیں سمجھا لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ سوئی خطرناک حد تک

زہریلی ہے۔ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ بہت عمدہ تھا۔“

”لیکن یہ سوئی یہاں کیسے آئی؟“ وہ پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی۔

”کسی سے گر گئی ہوگی۔“

”عجیب بات ہے۔“

شوکت نے وہ سوئی احتیاط سے تھرما میٹر رکھنے والی تالی میں رکھ لی اور بولا ”یہ ایک

دلچسپ چیز ہے۔ میں اس کا کیما دوی تجزیہ کروں گا۔ آپ کے کتے کی موت پر ایک بار پھر

اظہار افسوس کرتا ہوں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ ڈاکٹر میں آپ سے سچ کہتی ہوں کہ میں اس کتے کو بہت عزیز رکھتی تھی۔“ اس

نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”واقعی بہت اچھا کتا تھا۔ اس نسل کے گرے ہاؤنڈ کیاب ہیں۔“ شوکت نے جواب دیا۔

”ہونے والی بات تھی۔۔۔۔۔ افسوس تو ہوتا ہے مگر اب ہو ہی کیا سکتا ہے۔ مگر ایک بات

میری سمجھ میں نہیں آتی کہ سوئی یہاں آئی کیسے۔“

”میں خود بھی سوچ رہا ہوں۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ یہ سوئی اس خطی بوڑھے کی ہو۔ اس کے پاس عجیب و غریب چیزیں

ہیں..... منحوس کہیں کا۔“

”کیا آپ انہیں صاحب کے بارے میں تو نہیں کہہ رہی ہیں جو ابھی اس کوٹھی سے نکلے تھے۔“

”جی ہاں..... وہی ہوگا.....!“ نجمہ نے جواب دیا۔

”یہ کون صاحب ہیں۔ بہت ہی عجیب و غریب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

”یہ ہمارا کرایہ دار ہے۔ پروفیسر عمران..... لوگ کہتے ہیں کہ ماہر فلکیات ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ وہ دیکھئے اس نے مینار پر ایک دور بین بھی لگا رکھی ہے۔“

”پروفیسر عمران..... ماہر فلکیات..... یہ بہت مشہور آدمی ہیں۔ میں نے ان کی کئی کتابیں پڑھی ہیں۔ اگر وقت ملا تو میں ان سے ضرور ملوں گا۔“

”کیا کچھ گال کر..... دیوانہ ہے۔ وہ ہوش ہی میں کب رہتا ہے۔ وہ جانور سے بھی بدتر ہے۔“ نجمہ نے کہا۔ ”خیر ہٹائیے ان باتوں کو..... ڈاکٹر صاحب آپریشن میں کوئی خطرہ تو نہیں؟“

”جی نہیں آپ مطمئن رہئے..... انشاء اللہ کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے گی۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔ ”اچھا اب میں چلوں۔ مجھے آپریشن کی تیاری کرنا ہے۔“

ڈاکٹر شوکت قصبے کی طرف چل پڑا۔ ایک فحش کھائیوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

بال بال بچے

راستے بھر شوکت کا ذہن سوئی اور کتے کی موت میں الجھا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ خلش بھی اس کے دل میں کچھ کے لگا رہی تھی جو نجمہ سے گفتگو کرنے کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا

دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وہ زندگی بھر کھڑا اس سے اسی طرح باتیں کئے جائے۔ عورتوں سے بات کرنا اس کے لئے نئی بات نہ تھی۔ وہ قریب قریب دن بھر زسوں میں گھرا رہتا تھا اور پھر اسکے علاوہ اس کا پیشہ ایسا تھا کہ اور دوسری عورتوں سے بھی اس کا سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ لیکن نجمہ میں نہ جانے کونسی ایسی بات تھی جو وہ رہ کر اس کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے پیش کر دیتی تھی۔ ڈاکٹر توصیف کے گھر پہنچتے ہی وہ سب کچھ بھول گیا کیونکہ اب وہ آپریشن کی سکیم مرتب کر رہا تھا۔ وہ ایک زندگی بچانے جا رہا تھا..... ایک ماہر فن کی طرح اس کا دل مطمئن تھا..... اسے اپنی کامیابی کا اسی طرح یقین تھا جس طرح اس کا کہ وہ گیارہ بجے کھانا کھائے گا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر توصیف بھی نواب صاحب کی کار پر آ گیا۔
 ”کہئے ڈاکٹر صاحب کوئی خاص بات۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں، البتہ کتے کی موت سے ہر شخص حیرت زدہ ہے۔ لائیے دیکھوں تو وہ سوئی۔“ ڈاکٹر توصیف نے سوئی لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”یہ دیکھئے..... بڑی عجیب بات ہے۔ معلوم نہیں سوئی کس زہر میں بچھائی گئی ہے۔“
 ڈاکٹر شوکت تھرمامیٹر کی نگلی سے سوئی نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔
 ”دیکھتے ہی دیکھتے کتا ختم ہو گیا۔“

”گراموفون کی سوئی ہے۔“ ڈاکٹر توصیف نے سوئی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”معلوم نہیں کس زہر میں بچھائی گئی ہے۔“

”میرے خیال میں پوٹاشیم سائیٹرائڈ یا اس قبیل کا کوئی اور زہر ہے، ڈاکٹر شوکت نے سوئی کو لے کر پھر تھرمامیٹر کی نگلی میں رکھتے ہوئے کہا۔“

”مجھے تو یہ سوئی خبیث پروفیسر کی معلوم ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر توصیف نے کہا۔

”اس کی عجیب و غریب چیزیں اور حرکتیں دور تک مشہور ہیں۔“

”مجھے ابھی تک پروفیسر کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں معلوم۔ لیکن میں اس پر اسرار شخصیت کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے تو میں یہ جانتا ہوں کہ وہ

ایک مشہور ماہر فلکیات ہے۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

”اس کی زندگی ابھی تک پردہ راز میں ہے۔“ ڈاکٹر توصیف نے کہا۔ ”لیکن اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ اب سے دو سال پیشتر وہ ایک صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اس کے بعد اچانک اس کے عادات و اطوار میں تبدیلیاں ہونی شروع ہو گئیں اور اب تو سبھی کا یہ خیال ہے کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”میں نے تو صاحب اتنا بھیا تک آدمی آج تک نہیں دیکھا۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔
تھوڑی دیر تک خاموشی رہی اس کے بعد ڈاکٹر توصیف بولا۔ ”ہاں تو آپ کا کیا پروگرام ہے۔ میرے خیال سے تو اب دوپہر کا کھانا کھا لینا چاہئے۔“
کھانے کے دوران آپریشن اور دوسرے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اچانک ڈاکٹر شوکت کو کچھ یاد آ گیا۔

”ڈاکٹر صاحب میں جلدی میں اپنے اسٹنٹ کو کچھ ضروری ہدایات دینا بھول گیا ہوں.... اگر آپ کوئی ایسا انتظام کر سکیں کہ میرا رقعہ اس تک پہنچا دیا جائے تو بہت اچھا ہو۔“
ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

”چلئے اب دو کام ہو جائیں گے۔“ ڈاکٹر توصیف نے کہا۔ ”میں دراصل شہر ہی جانے کے لئے نواب صاحب کی کار لایا تھا۔ آپ رقعہ دے دیجئے گا اور ہاں کیوں نہ آپ کے ساتھیوں کو اپنے ساتھ لیتا آؤں۔“
”اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔“

”اس رقعے کے علاوہ کوئی اور کام.....؟“

”جی نہیں شکریہ۔ میرے خیال سے آپ ان لوگوں کو اسی طرف سے کٹھی لیتے جائیے گا۔“
”بہتر ہے..... چھ بجے آپ کے لئے کار بکھوا دی جائے گی۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں پیدل ہی آؤں گا۔“

”کیوں.....؟“

”بات دراصل یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ آپریشن ذرا نازک ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپریشن سے قبل اتنی ورزش ہو جائے جس سے جسم میں جستی پیدا ہو سکے۔“

”ڈاکٹر شوکت میں آپ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ درحقیقت ایک اچھے ڈاکٹر کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔“

ڈاکٹر توصیف کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر شوکت نے یکے بعد دیگرے وہ کتابیں پڑھنا شروع کیں جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ ایک کاغذ پر پنسل سے کچھ ڈائے گرام بنائے اور دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ پرانے ریکارڈوں کے کچھ فائل دیکھے۔ انہی مشغولیات میں دن ختم ہو گیا۔ تقریباً پانچ بجے اس نے کتابیں اور فائل ایک طرف رکھ دیئے۔ اسے ٹھیک چھ بجے یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ ممبر کا مہینہ تھا۔ شام کی کرنوں کی زردی پھسکی پھسکی سرخی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر توصیف کا نوکراڑے کی سینڈوچ اور کافی لے آیا۔ رات کا کھانا سلیم کی درخواست کے مطابق اسے کوشی میں کھانا تھا۔ اس لئے اس نے صرف ایک سینڈوچ کھائی اور دو کپ کافی کے بعد سگریٹ سلا کر ٹھیلے لگا۔ گھڑی نے چھ بجائے۔ اس نے کپڑے پہنے اور چتر کا عرصے پر ڈال کر روانہ ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ٹھلٹا ہوا جا رہا تھا۔ چاروں طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کھنی جھاڑیاں اور درختوں کی قطاریں تھیں جن کی وجہ سے سڑک خصوصاً اور زیادہ تاریک ہو گئی تھی۔ لیکن ڈاکٹر شوکت آپریشن کے خیال میں مگن بے خوف چلا جا رہا تھا۔ اس سے تقریباً پچاس گز پیچھے ایک دوسرا آدمی جھاڑیوں سے لگا ہوا چل رہا تھا۔ شاید اس نے ریزسول کے جوتے پہن رکھے تھے جس کی وجہ سے ڈاکٹر شوکت اس کے قدموں کی آواز نہیں سن رہا تھا۔ ایک جگہ ڈاکٹر شوکت سگریٹ سلاگنے کے لئے رکا ساتھ ہی وہ شخص بھی رک کر جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ جیسے ہی شوکت نے چلنا شروع کیا وہ پھر جھاڑیوں سے نکل کر اسی طرح اس کا تعاقب کرنے لگا۔

سڑک زیادہ چلتی ہوئی نہ تھی۔ وجہ یہ تھی یہ سڑک محض کوشی کے لئے بنائی گئی تھی۔ اگر نواب صاحب نے اپنی کوشی بستی کے باہر نہ بنوائی ہوتی تو پھر اس سڑک کا وجود بھی نہ ہوتا۔

شوکت کے وزنی جوتوں کی آواز اس سنان سڑک پر اس طرح گونج رہی تھی جیسے وہ جھاڑیوں میں دبک کر ٹیس ٹیس ریں ریں کرنے والے جھینگروں کو ڈانٹ رہی ہو..... شوکت چلتے چلتے ہلکے سروں میں سیٹی بجانے لگا۔ اسے اپنے جوتوں کی آواز سیٹی کی دھن پر تال دیتی معلوم ہو رہی تھی۔ کسی درخت پر ایک بڑے پرندے نے چونک کر اپنے پر پھڑپھڑائے اور اڑ کر دوسری طرف چلا گیا۔ جھاڑیوں کے پیچھے قریب ہی گیدڑوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ جو شخص ڈاکٹر شوکت کا پیچھا کر رہا تھا اس کا اب کہیں پتہ نہ تھا۔ کچھ آگے بڑھ کر بہت زیادہ گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں پر دونوں طرف کے درختوں کی شاخیں آپس میں مل کر اس طرح گنجان ہو گئی تھیں کہ آسمان نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ڈاکٹر شوکت دنیا، مافیہا سے بے خبر اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ اس کے گلے میں ایک موٹی سی ری کا پھندا پڑا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ پھندے کی گرفت تنگ ہوتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ وہ اوپر اٹھنے لگا۔ گلے کی رگیں پھول رہی تھیں۔ آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن آواز نہ نکلی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کا دل کنپٹیوں اور آنکھوں میں دھڑک رہا ہو۔ آہستہ آہستہ اسے تاریکی گہری ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ جھینگروں اور گیدڑوں کا شور دور خلا میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ پھر بالکل خاموشی چھا گئی۔ وہ زمین سے دو فٹ کی بلندی پر جھول رہا تھا۔ کوئی اسی درخت پر سے کود کر جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ پھر ایک آدمی اس کی طرف دوڑ کر آتا دکھائی دیا۔ اس کے قریب پہنچ کر اس نے ہاتھ ملتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا..... دوسرے لمحے میں وہ پھرتی سے درخت پر چڑھ رہا تھا۔ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر کودتا ہوا وہ اس شاخ پر پہنچ گیا جس سے ری بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ری ڈھیلی کر کے آہستہ آہستہ ڈاکٹر شوکت کے پیر زمین پر نکا دیئے پھر ری کو اسی طرح باندھ کر نیچے اتر آیا۔ اب اس نے جیب سے چاقو نکال کر ری کاٹی اور شوکت کو ہاتھوں پر سنبھالے ہوئے سڑک پر لٹا دیا۔ پھندا ڈھیلا ہوتے ہی بے ہوش ڈاکٹر گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پراسرار اجنبی نے دیا سلائی جلا کر اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ آنکھوں کے پپٹوں میں جنبش پیدا ہو چکی تھی۔ ایسا

معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ دس پانچ منٹ کے بعد ہوش میں آ جائے گا۔ دو تین منٹ گزر جانے پر اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اجنبی جلدی سے جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک کراہ کے ساتھ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ کچھ دیر قبل کے واقعات اس کے ذہن میں گونج اٹھے..... بے اختیار اس کا ہاتھ گردن کی طرف گیا۔ لیکن اب وہاں رسی کا پھندا نہ تھا۔ البتہ گردن بڑی بُری طرح دکھ رہی تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کس طرح بچ گیا۔ اب اسے فریدی مرحوم کے الفاظ بُری طرح یاد آرہے تھے اور ساتھ ہی سینٹا دیوی کی خواب کی بڑبڑاہٹ بھی یاد آ گئی تھی۔ ”راج روپ نگر“ اس کے سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ پڑا۔ وہ سوچنے لگا وہ بھی کتنا احمق تھا کہ اس نے فریدی کے الفاظ بھلا دیئے اور خوفناک جگہ پر اندھیری رات میں تنہا چلا آیا۔ اس کی جان لینے کی یہ دوسری کوشش تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس نیپالی کا نقشہ پھر گیا جس نے اسے دھمکی دی تھی۔ پھر اچانک وہ زہریلی سوئی یاد آئی اور پروفیسر کا بھیاںک چہرہ..... جو اس نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور ٹھیک اسی جگہ کتاب بھی اچھل کر گرا تھا۔ تو کیا پروفیسر..... پروفیسر..... لیکن آخر کیوں؟ یہ سب سوچتے سوچتے اسے اپنی موجودہ حالت کا خیال آیا اور وہ کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ چشمہ قریب ہی پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے چشمہ اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور تیزی سے کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ گھڑی میں وقت دیکھے لیکن پھر دیا سلائی جلا کر دیکھنے کی ہمت نہ پڑی۔

کوٹھی میں سب لوگ بے مبری سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے سات بجے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب آٹھ بج رہے تھے۔

”شوکت بہت ہی با اصول آدمی معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے۔“ ڈاکٹر توصیف نے باغ میں ٹھپکتے ہوئے کہا۔

نجمہ بار بار اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہی تھی۔

”کیا بات ہو سکتی ہے۔“ کنور سلیم نے بچوں کے بل کھڑے ہوتے ہوئے پیشانی پر

ہاتھ رکھ کر اندھیرے میں گھورتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ دیر میں گھر سے روانہ ہوا۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ کاربجوا دوں گا۔ لیکن اس نے کہا کہ میں پیدل ہی آؤں گا۔ آں یہ کون آرہا ہے..... ہلو..... ڈاکٹر..... بھئی انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھر اگئیں۔“

ڈاکٹر شوکت برآمدے میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ راستہ بھرا اپنے چہرے سے پریشانی کے آثار مٹانے کی کوشش کرنا آیا تھا۔

”مجھے افسوس ہے۔“ ڈاکٹر شوکت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اپنی حماقت کی وجہ سے چلتے وقت تاریخ لانا بھول گیا..... نتیجہ یہ ہوا کہ راستہ بھول گیا۔“

”لیکن آپ کے سر میں یہ اتنے سارے تنکے کہاں سے آگئے..... جی وہاں نہیں۔ پیچھے کی طرف.....!“ نجمہ نے مسکرا کر کہا۔

”تنکے..... اوہ..... کچھ نہیں..... ہٹائیے بھی کوئی ایسی خاص بات نہیں۔“ ڈاکٹر شوکت نے کچھ بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں..... بتائیے نا..... آخر بات کیا ہے؟“ کنور سلیم نے سنجیدگی سے کہا۔

”ارے وہ تو ایک پاگل کتا تھا..... راہ میں اس نے مجھے دوڑایا۔ اندھیرا کافی تھا..... میں شوکر کھا کر گر پڑا۔ وہ تو کہنے ایک راگبیر ادھر آ نکلا ورنہ.....!“

”آج کل دبیر میں پاگل کتا۔“ نجمہ نے حیرت سے کہا۔ ”کتے تو عموماً گرمیوں میں پاگل ہوتے ہیں۔“

”نہیں..... یہ ضروری نہیں۔“ کنور سلیم نے جواب دیا۔ ”اکثر سردیوں میں بھی بعض کتوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ خیر..... آپ خوش قسمت تھے ڈاکٹر شوکت..... پاگل کتوں کا زہر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے۔“

”ہاں بھئی ڈاکٹر..... وہ آپ کے آدمیوں نے بیمار کے کمرے میں ساری تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔“

”وہ لوگ اس وقت وہیں ہیں.....!“ ڈاکٹر تو صیف نے کہا۔

”آپ کے انتظار میں شاید ان لوگوں نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔“ نجمہ بولی۔

”میرا انتظار آپ لوگوں نے ناحق کیا۔ میں آپریشن سے قبل تھوڑا سا سوپ پیتا ہوں۔

کھانا کھالینے کے بعد دماغ کسی کام کا نہیں رہ جاتا.....!“

”جی ہاں! میں نے بھی اکثر کتابوں میں یہی پڑھا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ

دنیا کے بڑے آدمی نے یہ ضرور کہا ہوگا۔“ نجمہ نے شوخی سے کہا۔ ڈاکٹر شوکت نے مسکرا کر اس

کی طرف دیکھا۔ نجمہ سے نگاہیں ملتے ہی وہ زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

”خیر صاحب..... وہ کچھ سہی میں تو دن بھر میں پانچ سیر سے کم نہیں کھاتا۔“ کنور سلیم نے

نفس کر کہا۔ ”کھانا دیر سے خطر ہے۔ ہر تندرست آدمی کا فرض ہے کہ اسے انتظار کی زحمت سے

بچائے۔“

سب لوگ کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

پرانی کوٹھی کے باہر

پرانی کوٹھی کے پائیں باغ میں پروفیسر عمران کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ کبھی کبھی دونوں کی

آوازیں بلند ہو کر غلاء میں ڈوب جاتیں۔

پروفیسر کہہ رہا تھا۔ ”لیکن میں نہیں جاؤں گا۔“

”تو اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے میری جان۔“ دوسری آواز سنائی دی۔ ”نہ جانے

میں تمہارا ہی نقصان ہے؟“

”میرا نقصان.....!“ پروفیسر کی آواز آئی۔ ”یونان اور روم کے دیوتاؤں کی قسم ہرگز نہ

جاؤں گا۔“

”تمہیں چلنا پڑے گا۔“ کسی نے کہا۔

”سنو اے ابا تیل کے بچے..... تم میں اتنی ہمت نہیں کہ مجھے میری مرضی کے خلاف کہیں

لے جاسکو۔“ پروفیسر چیخا۔

”خیر نہ جاؤ لیکن تمہیں اس کے لئے پچھتانا پڑے گا۔ دیکھنا ہے کہ تمہیں کل سے سفیدہ

کیسے ملتا ہے۔“ دوسرے آدمی نے کہا اور باغ سے نکلنے لگا۔

”ٹھہرو..... ٹھہرو..... تو ایسے بات کرو نا۔ تم نے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا کہ تم بیر بہوٹی کے

بچے ہو۔“ پروفیسر فیس کر بولا۔

”بیر بہوٹی..... ہاں بیر بہوٹی..... مگر اس کے لئے تمہیں میرے ساتھ مالی کے جھونپڑے

تک چلنا ہوگا۔“

”اچھا تو آؤ پھر چلیں۔“ پروفیسر نے کہا اور دونوں مالی کے جھونپڑے کی طرف چل

پڑے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد پروفیسر نکلز اتنا ہوا مالی کے جھونپڑے سے باہر نکلا۔ وہ اکیلا

تھا اور اس کے کاندھے پر ایک وزنی گٹھڑی تھی۔ ایک جگہ رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا، پھر

مالی کے جھونپڑے کی طرف گھومنا شروع کر کہنے لگا۔

”اے تو نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ میں تجھے کتے کا گوشت کھلا دوں گا۔ چھوٹے کی اولاد

نہیں تو..... مرنے، زعل، مشرتی، عطار دسب کے سب تیری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ اے

میں وہ ہوں جس نے سکندر اعظم کا مرغا چرایا تھا۔ چمکاؤ مجھے سلام کرنے آتے ہیں۔ میں اچھی

طرح جانتا ہوں کہ تو اپنے دادا کا نطفہ ہے۔ چلا ہے وہاں سے کھیاں مارنے..... بڑا آیا کہیں کا

تیس مارخاں۔ تیس مارخاں کی ایسی کی تھی..... نہیں جانتا کہ میں بھوتوں کا سردار ہوں۔ آؤ

اے غر فوس اے کھا جاؤ۔ آؤ اے ارسلانوس اے چبا جاؤ۔ چیلوں کی حرافہ نانی اشقلو نیا تو

کہاں ہے۔ دیکھ میں ناچ رہا ہوں۔ میں تیرا بھتیجا ہوں..... آ جا پیاری.....!“ یہ کہہ کر پروفیسر

نے وہیں پر ناچنا شروع کر دیا۔ پھر وہ سینہ پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔ ”میں اس آگ کا پجاری ہوں

جو مرغ میں جل رہی ہے۔ ہزار ہا سال سے میں اس کی پوجا کرتا آرہا ہوں۔ میں پانچ ہزار سال سے انتظار کر رہا ہوں لیکن ستارہ کبھی نہ ٹوٹے گا۔ اے کہ میں نے تیرے لئے خرگوش پالے۔ اے کہ میں تجھے گلہریوں کے کباب کھلاتا ہوں..... میں تلیوں کے پروں سے سگریٹ بنا کر تجھے پلاتا ہوں۔ اے پیارے ایلئس تو کہاں ہے۔ میں تجھے اپنا کان کاٹ کر کھلا دوں گا۔“ وہ اور نہ جانے کیا بڑبڑاتا اچھلتا کودتا ہوا پرانی کونٹھی کے باغ میں غائب ہو گیا۔

پروفیسر کی شرارت

مریض کے کمرے کا منظر حد درجہ متاثر کن تھا۔ نرس اور ڈاکٹر سب سفید کپڑوں میں ملبوس آہستہ آہستہ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ آپریشن ٹیبل جو سول ہسپتال سے خاص اہتمام کے ساتھ یہاں لائی گئی تھی کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ مریض کو اس پر لٹایا جا چکا تھا۔ کمرے میں بہت زیادہ طاقت والے بلب روشن کر دیئے گئے تھے۔ سلاخچوں میں گرم و سرد پانی رکھا ہوا تھا۔ اسی کے قریب ایک دوسری میز پر عجیب و غریب قسم کے آپریشن کے اوزار اور ربڑ کے دستانے پڑے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر شوکت کچھ دیر قبل پیش آئے ہوئے حادثے کو قطعی بھلا چکا تھا۔ اب اس کا دھیان صرف آپریشن کی طرف تھا۔ ایک آدمی کی زندگی خطرے میں تھی۔ تمام تر کوششیں صرف کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ نوجوان ماہر اسے بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر اسے اس کیس میں کامیابی ہوگئی تو اس کی شخصیت کہیں کی کہیں جا پہنچے گی۔ کامیابی اسے ترقی کے زینوں پر لے جائے گی..... اور ناکامی! لیکن..... نہیں..... اس کے ذہن میں ناکامی کے خیال کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ وہ ایک مشاق ماہر فن کی طرح مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر تو صیف بھی کمرے میں موجود تھا۔ لیکن اس کی حیثیت ایک تماشاگر جیسی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا اور متحیر تھا کہ یہ نوجوان لڑکا کس

طرح سکون و اطمینان کے ساتھ اپنی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ایسے موقعوں پر اتنا اطمینان تو اس نے اچھے اچھی معمر اور تجربہ کار ڈاکٹروں کے چہروں پر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی تعریفیں کر رہا تھا۔

باہر برآمدے میں نواب صاحب کی بہن اور نجمہ بیٹھی تھیں۔ دونوں پریشان نظر آ رہی تھیں۔ کنور سلیم ٹہل ٹہل کر سگریٹ پی رہا تھا۔

”مئی کیا وہ کامیاب ہو جائے گا۔“ نجمہ نے بے تابی سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن کتنی دیر لگے گی.....؟“

”پریشان مت ہو بیٹی۔“ بیگم صاحبہ بولیں۔ ”میرا خیال ہے کہ کافی عرصہ لگے گا۔ ممکن ہے صبح ہو جائے۔ لہذا ہم لوگوں کا یہاں اس طرح بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ کیوں نہ ہم ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھیں۔ غالباً کافی اب تیار ہو گئی ہوگی۔ سلیم کیا آج تم کافی نہ پو گے۔“

”کافی کا کسے ہوش ہے پچو بھی صاحبہ۔“ سلیم نے سگریٹ کو برآمدے میں بچھے ہوئے قالین پر گرا کر چہرے سے رگڑتے ہوئے کہا۔ ”میں نجمہ سے زیادہ پریشان ہوں۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ ایسے وقت میں بھی کافی نہیں بھولیں۔“

”تم ساری قالینوں کا ستیا ناس کر دو گے۔“ بیگم صاحبہ نے ناک بھوں سکوڑ کر کہا۔ ”کیا سگریٹ کو دوسری طرف نہیں پھینک سکتے۔“

”جہنم میں گئی قالین.....!“ وہ ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ ”میرا دماغ اس وقت ٹھیک نہیں۔“

”عورت نہ بنو۔“ بیگم صاحبہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ابھی کتنی دیر کی بات ہے کہ تم میری مخالفت کے باوجود بھی آپریشن کی حمایت کر رہے تھے۔ اپنی حالت کو سنبھالو۔ تمہیں تو ہم لوگوں کو دلاسا دینا چاہئے۔“

”میں کوشش کرتا ہوں کہ خود کو سنبھالوں لیکن یہ ممکن نہیں۔ مجھے کرنل تیواری کے الفاظ یاد آرہے ہیں جس نے کہا تھا کہ بچنے کی امید نہیں۔ آخر حق لڑا کس امید پر آپریشن کر رہا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ خطرے کو جلد سے جلد قریب لانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”نہیں کنور صاحب.....!“ ڈاکٹر توصیف نے بیمار کے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔
 ”مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ وہ جلد سے جلد نواب صاحب کو خطرات سے دور کرے گا۔“
 ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ سلیم اسکی طرف گھوم کر بولا۔ ”کیا آپ پریشن شروع ہو گیا۔“
 ”نہیں..... ابھی وہ لوگ تیاری کر رہے ہیں اور میرا وہاں کوئی کام بھی نہیں۔ میں اس لئے یہاں چلا آیا کہ میں یہاں زیادہ کارآمد ثابت ہو سکوں گا۔“ ڈاکٹر توصیف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ بہت اچھے ہیں ڈاکٹر..... می تو کافی ضبط و تحمل والی ہیں لیکن شاید مجھے اور سلیم کو جلد از جلد طبی امداد کی ضرورت پیش آئے گی۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ اس نوجوان ڈاکٹر کی کامیابی پر اس قدر یقین رکھتے ہیں۔ وہ کس قدر سنجیدہ اور مطمئن ہے۔“
 ”اور ساتھ ہی ساتھ کافی خوبصورت بھی۔“ سلیم نے کسی قدر تلخی سے کہا۔
 ”تم کیا بک رہے ہو سلیم۔“ بیگم صاحبہ تیزی سے بولیں اور نجمہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔
 ”معاف کیجئے گا پھوپھی صاحبہ میں بہت پریشان ہوں۔“ سلیم یہ کہہ کر ٹھہلا ہوا برآمدے کے دوسرے کنارے تک چلا گیا۔

”کنور صاحب میرے خیال سے بجلی کا انتظام بالکل ٹھیک ہوگا۔ شاید ڈائنا مو کی دیکھ بھال آپ ہی کرتے ہیں۔“ ڈاکٹر توصیف نے کہا۔

”جی ہاں..... کیوں..... ڈائنا مو بالکل ٹھیک چل رہا ہے لیکن اسکے پوچھنے کا مطلب.....!“ سلیم نے ڈاکٹر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب صاف ہے۔“ ڈاکٹر توصیف نے کہا۔ ”اگر خدا نخواستہ ڈائنا مو فیل ہو گیا تو اندھیرے میں آپ پریشن کس طرح ہوگا۔ ایک بڑے آپریشن کے لئے کافی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”بظاہر تو ڈائنا مو فیل ہونے کا کوئی امکان نہیں لیکن اگر فیل ہی ہو گیا تو میں کیا کر سکوں گا۔“ انف یہ ایک خطرناک خیال ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوا تو ڈاکٹر شوکت بڑی مصیبت میں

پڑ جائے گا۔ اوہ نہیں نہیں..... میرے خدا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا.....!“ کنور سلیم کے چہرے پر بے چینی کے آثار پیدا ہو گئے۔

اتنے میں ایک نوکر داخل ہوا۔

”کیوں کیا ہے.....!“ سلیم نے اس سے پوچھا۔

”پروفیسر صاحب نیچے کھڑے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔“ نوکر نے کہا۔

”پروفیسر..... مجھے..... اس وقت۔“ سلیم نے حیرت سے کہا۔

”جاؤ بھی..... نیچے جاؤ.....!“ بیگم صاحبہ بیزاری سے بولیں۔ ”کہیں وہ پاگل یہاں نہ

چلا آئے۔“

”مجھے حیرت ہے کہ وہ اس وقت یہاں کس لئے آیا ہے۔“ سلیم نے نوکر سے کہا۔

”کیا تم نے اسے آپریشن کے متعلق نہیں بتایا.....؟“

”حضور میں نے انہیں ہر طرح سمجھایا..... لیکن وہ سنتے ہی نہیں۔“

”خیر چلو دیکھوں کیا بکنا ہے۔“ سلیم نے کہا۔ ”اس پاگل سے تو میں ٹک آ گیا ہوں۔“

سلیم نیچے آیا..... پروفیسر باہر کھڑا تھا۔ اس نے سردی سے بچنے کے لئے سر پر مفلر لپیٹ

رکھا تھا اور چہرہ کا کارل اس کے کانوں کے اوپر تک چڑھا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ

سردی کی وجہ سے سکرا جا رہا تھا۔

”کیوں پروفیسر کیا بات ہے؟“ سلیم نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

”ایک غیر معمولی چمکدار ستارہ جنوب کی طرف نکلا ہے۔“ پروفیسر نے اشتیاق آمیز لہجے

میں کہا۔ ”اگر تم اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلو۔“

”جہنم میں گئی معلومات.....!“ سلیم نے جھنجھلا کر کہا۔ ”کیا اتنی سی بات کے لئے تم

دوڑے آئے ہو۔“

”بات تو کچھ دوسری ہے۔ میں تمہیں بہت سی عجیب چیز دکھانا چاہتا ہوں۔ ایسی چیز تم

نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔“ اس نے سلیم کا بازو پکڑ کر اسے پرانی کوشی کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

سلیم چلتے لگا لیکن اس نے لوہے کی موٹی سلاخ کو نہ دیکھا جو پروفیسر اپنی آستین میں چھپائے ہوئے تھا۔

”کھٹ.....!“ تھوڑی دور چلتے کے بعد پروفیسر نے وہ سلاخ سلیم کے سر پر دے ماری۔ سلیم بغیر آواز نکالے چکرا کر دم سے زمین پر آ رہا۔ پروفیسر حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ جھکا اور بے ہوش سلیم کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ہلکے پھلکے بچے کو اٹھا لیتا ہے۔ وہ تیزی سے پرانی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ یہ سب اتنی جلدی اور خاموشی سے ہوا کہ وہ نوکر جو ہال میں سلیم کا انتظار کر رہا تھا وہ یہی سوچتا رہ گیا کہ اب سلیم پروفیسر کو اس کی کوٹھی میں دھکیل کر واپس آ رہا ہوگا۔

پرانی کوٹھی میں پہنچ کر پروفیسر نے بیہوش سلیم کو ایک کرسی پر ڈال دیا اور جھک کر سر کے اس حصے کو دیکھنے لگا جو چوٹ لگنے کی وجہ سے پھول گیا تھا۔ اس نے پراطمینان انداز میں اس طرح سر ہلایا جیسے اسے یقین ہو کہ وہ ابھی کافی دیر تک بے ہوش رہے گا۔ پھر اس حیرت انگیز بوڑھے نے سلیم کو پیٹھ پر لاد کر مینار پر چڑھنا شروع کیا۔ بالائی کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے ٹول کر سلیم کو ایک بڑے صوفے پر ڈالا اور موم بتی جلا کر طاق پر رکھ دی۔

ہلکی روشنی میں چہرے کے کالر کے سائے کی وجہ سے اس کا چہرہ اور زیادہ خوفناک معلوم ہونے لگا تھا۔ اس نے سلیم کو صوفے سے باندھ دیا پھر وہ دور بین کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گیا اور دور بین کے ذریعہ نواب صاحب کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ نواب صاحب کے کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر اور نرسوں نے اپنے چہروں پر سفید نقاب لگائے تھے۔

ڈاکٹر شوکت کھولتے ہوئے پانی سے ربڑ کے دستانے نکال کر پہن رہا تھا۔ وہ سب آپریشن کی میز کے گرد کھڑے ہوئے تھے۔ آپریشن شروع ہونے والا تھا۔

”بہت خوب.....!“ پروفیسر بڑبڑایا۔ ”میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا لیکن آخر اس سردی کے باوجود بھی انہوں نے کھڑکیاں کیوں نہیں بند کیں۔“

نواب صاحب کی کوٹھی کے گرد و پیش عجیب طرح کی پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

چھوٹے سے لے کر بڑے تک کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بیمار کے کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ بیگم صاحبہ کا سخت حکم تھا کہ کسی قسم کا شور نہ ہونے پائے۔ لوگ اتنی خاموشی سے چل پھر رہے تھے جیسے وہ خواب میں چل رہے ہیں۔

کونشی میں نوکرانیاں بچوں کے بل چل رہی تھیں۔ گھر کے سارے کتے باغ کے آخری کنارے پر ایک خالی جھونپڑے میں بند کر دیئے گئے تھے تاکہ وہ کونشی کے قریب شور نہ مچا سکیں۔ پروفیسر دور بین پر جھکا ہوا اپنے گرد و پیش سے بے خبر بیمار کے کمرے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا محو تھا کہ اس نے سلیم کے جسم کی حرکت کو بھی نہ محسوس کیا۔ سلیم آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہا تھا۔ ایک عجیب قسم کی سنسناء اس کے جسم میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بازوؤں پر رسی کے تناؤ کو بھی نہ محسوس کیا۔ دو تین بار سر جھٹکنے کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی پھیلی نظر آ رہی تھی۔ پھر دور ایک ٹمنٹا ہوا تارہ دکھائی دیا۔ تارے کے چاروں طرف ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ آہستہ آہستہ روشنی پھیلتی گئی۔ موم بتی کی لو تو تھرا رہی تھی۔ پروفیسر دور بین پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر یہ کیا..... وہ بندھا کیوں ہے۔ رفتہ رفتہ کچھ دیر قبل کے واقعات اسے یاد آ گئے۔

”پروفیسر آخر یہ کیا حرکت ہے۔“ اس نے بھرائی ہوئی نحیف آواز میں قہقہہ لگا کر کہا۔
 ”آخر اس مذاق کی کیا ضرورت تھی۔“

”اچھا تم جاگ گئے۔“ پروفیسر نے سراٹھا کر کہا۔ ”کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ تم اس وقت اتنے ہی بے بس ہو جتنے کہ میرے دوسرے شکار..... تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں اب گلہریوں، خرگوشوں اور مینڈکوں کے ساتھ ہی ساتھ آدمیوں کا بھی شکار کرنے لگا ہوں۔ کیوں ہے نہ دلچسپ خبر.....؟“

پہلے تو سلیم نہ سمجھ سکا۔ لیکن دوسرے لمحے میں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کا سارا خون منجمد ہو گیا ہو۔ وہ لرز گیا..... وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بوڑھے نے اپنے دوسرے شکاروں کا حوالہ کیوں دیا ہے..... تو..... کیا..... تو..... کیا..... اب وہ اپنی خونی پیاس بجھانے کے لئے

جانوروں کے بجائے آدمیوں کا شکار کرنے لگا۔

ارے!

سلیم نے شدید گھبراہٹ کے باوجود بھی لاپرواہی کا انداز پیدا کر کے قہقہہ لگانے کی کوشش کی۔

”بہت اچھے پروفیسر..... لیکن مذاق کا وقت اور موقع ہوتا ہے۔ چلو..... شاباش یہ رسیاں

کھول دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں.....!“

”صبر..... صبر..... میرے اچھے لڑکے۔“ اس نے اس کی طرف جھک کر مسکراتے ہوئے

کہا۔ ”اب میری باری آئی ہلہلا۔“

”تمہاری باری..... کیا مطلب.....!“ سلیم نے چونک کر کہا۔

”کیا تم نہیں جانتے۔“ پروفیسر نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”کہو کہو میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔“ سلیم نے بے پرواہی سے کہا۔

”میرا مقصد یہ تھا کہ نوجوان ڈاکٹر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔“ پروفیسر نے

پرسکون لہجے میں کہا ”اور اسے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم دوبارہ آزاد کر دیئے گئے تو ایسا نہ

ہو سکے گا۔ کیونکہ مجھے خوف ہے..... بہر حال میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ سکون و اطمینان کے ساتھ

نواب صاحب کی جان بچا سکے۔ اسی لئے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔ میرے بھولے سلیم کیا

سمجھے؟ میں..... کیا میں چالاک نہیں.....!“

”بہت چالاک ہو کیا کہنے.....!“ سلیم نے ہنس کر کہا۔

”تم یہاں بالکل بے بس ہو۔ یہاں میں تمہاری خبر گیری بھی کروں گا اور بیمار کے کمرے

کا منظر بھی دیکھ سکوں گا۔“ پروفیسر نے دور بین کے شیشے میں آنکھ لگاتے ہوئے کہا۔ ”نہ تو میں

احق ہوں اور نہ میری دور بین..... محض مذاق ہے..... کیا سمجھے۔“

اچانک سلیم میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس کی بھنویں تن گئیں۔ کچھ دیر قبل جو ہونٹ مسکرا رہے تھے بھینچ کر رہ گئے۔ آنکھوں کی شرارت آمیز شوخی ایک بہت ہی خوفناک قسم کی چمک میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اب تک ہنس مکھ اور کھلنڈ رانہ جوان رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے چہرے پر سے ایک گہری نقاب ہٹ گئی ہو۔ وہ ایک خونخوار بھیڑیے کی طرح ہانپ رہا تھا۔

”ان رسیوں کو کھول دو سؤر کے بچے۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”ورنہ میں تمہارا سر پھوڑ دوں گا۔“

”دھرج..... دھرج..... میرے پیارے بچے۔“ پروفیسر نے مڑ کر پرسکون لہجے میں کہا۔

”کل تک میں یقیناً تم سے خائف تھا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے لیکن تم اس وقت میری گرفت میں ہو..... قاتل..... سازشی..... تم بہت خطرناک ہوتے جا رہے ہو۔ ایسی صورت میں تمہاری نگرانی کی ضرورت ہے۔“

”تم دیوانے ہو..... قطعی دیوانے۔“ سلیم نے تیزی سے کہا۔

”شاید ایسا ہی ہو.....!“ پروفیسر نے لاپرواہی سے کہا۔ ”لیکن میں اتنا دیوانہ بھی نہیں کہ تمہاری سازشوں کو نہ سمجھ سکوں تم اب تک مجھے ایک بے جان مگر کارآمد اوزار کی طرح استعمال کرتے آئے ہو لیکن آج کی رات میری..... کیا سمجھے۔“

سلیم کے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ غصے کی جگہ خوف نے لے لی۔ وہ اب تک پروفیسر کو پاگل سمجھتا تھا کہ وہ جدھر اسے لے جانا چاہتا ہے وہ بغیر سمجھے بوجھے چلا جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ محتاط رہا۔ اس نے آج تک اپنی اصلی سرگرمیوں کی بھنک بھی پروفیسر کے کان میں نہ پڑنے دی تھی۔ پھر اسے اسکی سرگرمیوں کا علم کیونکر ہوا۔ وہ خوفزدہ ضرور تھا لیکن ناامید نہیں۔ کیونکہ اسکی زندگی کے دوسرے پہلو کا علم پروفیسر کے علاوہ کسی اور کو نہ تھا۔ پروفیسر جو پاگل تھا۔

”تم قتل کی بات کرتے ہو۔“ سلیم نے سکون کے ساتھ کہا۔ ”خدا کی قسم اگر تم نے یہ رسی فوراً ہی نہ کھول دی تو میں اپنی اس دھمکی کو پورا کر دکھاؤں گا۔ جو اکثر تمہیں دیتا رہا ہوں۔ میں پولیس کو اطلاع دے دوں گا کہ تم قاتل ہو۔ اپنے اسٹنٹ کے قاتل.....!“

”میں.....!“ پروفیسر نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”یہ میں آج ایک نئی اور دلچسپ خبر سن رہا ہوں۔ میں نے یہ قتل کب کیا تھا۔“

”کب کیا تھا.....!“ سلیم نے کہا۔ ”اتنی جلدی بھول گئے۔ کیا تم نے اپنے اسٹنٹ فیم کو اپنے بنائے ہوئے غبارے میں بٹھا کر نہیں اڑایا تھا۔ جس کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔“

پروفیسر خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب قسم کی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ ”اور ہاں اسی حادثے کے بعد سے میرا دماغ خراب ہو گیا اور تمہیں اس واقعہ کا علم ہو گیا تھا۔ لہذا تم نے مجھے بلیک میل کرنا شروع کر دیا مجھ سے ناجائز کاموں میں مدد لیتے رہے۔ مجھ سے روپیہ اینٹھتے رہے۔ لیکن برخودار شاید تمہیں اس کا علم نہیں کہ میں حال ہی میں ایک سرکاری جاسوس سے مل چکا ہوں۔ تم خوفزدہ کیوں ہو رہے ہو۔ میں نے تمہارے متعلق اس سے کچھ نہیں کہا۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نعیم میرے غبارے کے ٹوٹنے سے مرانہیں۔ بلکہ وہ اس وقت بھی مدراس کے کسی گھنیا سے شراب خانے میں نشے سے چوراوندھا پڑا ہوگا اور مجھے اس کا بھی علم ہے کہ اس نے جو خطوط مجھے لکھے تھے تم نے راستے ہی سے غائب کر دیئے۔ بہت عرصہ ہوا تمہیں اس کے زندہ ہونے کا ثبوت مل گیا تھا۔ لیکن تم مجھے پاگل سمجھ کر روپے اینٹھنے کے لئے اندھیرے ہی میں رکھنا چاہتے تھے۔ کھومیاں سلیم کیسی رہی۔ کیا اب میں تمہیں وہ باتیں بھی بتاؤں جو میں تمہارے متعلق بھی جانتا ہوں۔“

کنور سلیم سہم کر رہ گیا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پروفیسر کا پاگل پن کسی نئے موڑ پر پہنچ گیا ہے جسے وہ اب تک ایک بے ضرر کچوا سمجھتا رہا وہ آج پھن اٹھائے اس پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”خیر پروفیسر چھوڑو ان حماقت کی باتوں کو۔“ سلیم نے کوشش کر کے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میری رسیاں کھول دو..... آدی بنو۔ تم میری عزیز ترین دوست ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اس سے بھی بڑی دوربین خرید دوں گا۔ اتنی بڑی کہ سچ ایک شیشے کا گنبد معلوم ہوگی۔“

”ٹھہرو سلیم ٹھہرو.....!“ پروفیسر نے دوربین کے شیشے پر جھک کر کہا۔ ”میں ذرا بیمار کے

کمرے میں دیکھ لوں۔ ہوں تو ابھی آپریشن شروع نہیں ہوا۔ ایسے خطرناک آپریشنوں میں کافی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نوجوان ڈاکٹر نواب صاحب کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن سلیم یہ تو بڑی بُری بات ہے۔ اگر نواب صاحب دس بیس برس اور زندہ رہے تو کیا ہوگا۔ تو تمہاری وراثت تم تک جلد نہ پہنچ سکے گی۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔“ سلیم نے کہا۔ ”میں بہر حال اُن کا وارث ہوں اور پھر مجھے اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا میں کم دولت مند ہوں۔“

”خیر..... خیر..... تمہاری دولت کا حال تو میں اچھی طرح جانتا ہوں اسی لئے تو ایک بے بس بوڑھے سے روپے اٹھتے رہے سو بیٹے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہاری تنگدستی اب نواب صاحب کی موت کی خواہاں ہے اسی لئے میں نے تمہیں اس وقت تکلیف دی ہے مجھے امید ہے کہ تم ایک سعادت مند بچے کی طرح اس کا کچھ خیال نہ کرو گے کیا تم نے آج ڈاکٹر توصیف کو اسی لئے شہر نہیں بھیج دیا کہ نوجوان ڈاکٹر سچ کچھ پیدل آنے پر مجبور ہو جائے۔“

”کیا فضول بکواس ہے۔“ سلیم نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اور پھر تم ایک رسی لے کر درخت پر چڑھ گئے۔“ پروفیسر بولتا رہا۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ میں کچھ نہیں جانتا میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ڈاکٹر شوکت سچ کیسے گئے لیکن میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ تم مجھے اندھیرے کی چمکاؤں سمجھتے ہو اور تمہارا خیال بھی درست ہے۔ اندھیرا مجھ پر سورج کی طرح روشن رہتا ہے۔ میں اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔ کیا میں نہیں جانتا۔“

”تم کچھ نہیں جانتے۔“ سلیم نے مردہ آواز میں کہا۔ ”یہ محض تمہارا قیاس ہے“

”تم اسے قیاس کہہ رہے ہو لیکن یہ سو فیصد سچ ہے۔ دیکھو سلیم ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیا میں یہ نہیں جانتا کہ ڈاکٹر شوکت کو قتل کر دینے کی ایک وجہ اور بھی ہے جس کا تعلق آپریشن سے نہیں۔“

”کیا.....!“ سلیم بے اختیار چونک کر چیخا۔

”ٹھیک ٹھیک۔“ پروفیسر نے سر ہلایا۔ ”تمہاری چیخ ہی اقبال جرم ہے۔“

”کیا تم نے اس خنجر باز نیپالی کو روپیہ دے کر اس قتل پر آمادہ نہیں کیا تھا۔ اس اجاق نے دھوکے میں ایک بے گناہ عورت کو قتل کر دیا۔“

”یہ جھوٹ ہے..... یہ جھوٹ ہے۔“ سلیم بے صبری سے بولا۔ ”لیکن تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا۔ یہ محض قیاس ہے..... بالکل قیاس.....!“

”مجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا۔ کیونکہ دنیا میں تمہیں ایک بڑے چالاک ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس دن تم نے ایک رپورٹر پر گولی چلائی تھی اور وہ رائل میرے ہاتھ میں دے کر خود بھاگ گئے تھے۔ محض اس لئے کہ مجھے پاگل تصور کرتے ہوئے اس واقعہ کو محض اتفاقیہ سمجھا جائے۔ اور کہو تو یہ بھی بتا دوں گا کہ تم اس رپورٹر کو کیوں مارنا چاہتے ہو۔ تم اسے پہچان گئے تھے۔ تمہیں یقین ہو گیا تھا کہ اسے تمہاری حرکتوں کا علم ہو گیا ہے۔ اس وقت تو وہ بچ گیا تھا لیکن آخر کار اسے تمہاری ہی گولیوں سے ہلاک ہونا پڑا..... کیوں ہے نا بچ۔“

”نہ جانے تم کس کی باتیں کر رہے ہو۔“ سلیم نے سنبھالا لے کر کہا۔

”انس..... پک..... ٹر..... فری..... دی کی۔“ پروفیسر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے رک رک کر کہا۔

سلیم کے ہاتھ ہیر ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ ایک لخت ست پڑ گیا۔

”تمہاری دھمکیاں میرا اب کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ میں اب تمہارے گال پر اس طرح چاٹنا مار سکتا ہوں۔“ پروفیسر نے اٹھ کر اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نہ میں ان سب باتوں کی اطلاع نجمہ اور اس کی ماں کو دے دوں۔ پولیس کو تو میں اسی وقت مطلع کر دوں گا لیکن تم یہ سوچتے ہو گے کہ پولیس میری باتوں کا اعتبار نہ کرے گی کیونکہ میں پاگل ہوں۔“

”نہیں، نہیں پروفیسر تم جیت گئے۔ تم مجھ سے زیادہ چالاک ہو۔“ سلیم نے آخری پانسہ

پھینکا۔ ”اس ری کو کاٹ دو۔ میں تمہارے لئے ایک بڑی شاندار آبزرویٹری بنوا دوں گا۔“

”تمہارا ذہن کسی وقت بھی چال بازیوں سے باز نہیں آتا۔ اچھا میں تم سے صلح کر لوں گا مگر اس شرط پر کہ تم اس مینار میں کسی راز کو راز نہ رکھو گے۔ اس کے بعد یہ یقین رکھو کہ تمہارے سب راز مرتے دم تک میرے سینے میں دفن رہیں گے میں اسی لئے تم سے یہ سب اگوار ہا ہوں کہ تم نے مجھے بہت دنوں تک بلیک میل کیا ہے۔ اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ واقعی تم نے اس نیپالی سے ڈاکٹر شوکت کو قتل کرانے کی سازش کی تھی۔“

”میرے خیال سے تم بھی اتنا ہی جانتے ہو جتنا میں..... ہاں میں نے اس کے لئے روپیہ دیا تھا۔“

”پھر تمہی نے اسے قتل بھی کر دیا۔ اس لئے کہ کہیں وہ نام نہ بتا دے۔“

”ہاں..... لیکن ٹھہرو.....!“

”انسپکٹر فریدی پر قتل کی نیت سے تم نے ہی گولی یا گولیاں چلائی تھیں۔“

”ہاں..... لیکن تم تو اس طرح سوال کر رہے ہو جیسے جیسے.....!“

”تم نے ڈاکٹر شوکت کے گلے میں رسی کا پھندا بھی ڈالا تھا۔“ پروفیسر نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”پھر تمہارا دماغ خراب ہو چلا۔“ سلیم نے کہا۔ ”ہاں میں نے پھندا تو ڈالا تھا۔“ لیکن

پھر اس نے کہا۔ ”تم نے ابھی کہا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس

رسی کو کاٹ د۔ میں تم سے قطعی خوف زدہ نہیں۔ اس لئے کہ اب ہم دونوں دوست ہیں۔“

”تمہارے ہوائی قلعے بہت زیادہ مضبوط معلوم نہیں ہوتے۔“ پروفیسر نے کہا۔ لیکن اس

بار اس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔ سلیم چونک پڑا..... سکڑا سکڑایا..... پروفیسر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس

نے اپنے سر پر بندھا ہوا مفلک کھول دیا۔ چشمر کے کالر نیچے گرا دیئے اور موسم بقی طاق پر سے اٹھا

کراپنے چہرے کے قریب لا کر بولا۔

”لو بیٹھا دیکھ لو میں ہوں تمہارا باپ انسپکٹر فریدی۔“

”ارے.....!“ سلیم کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا

لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود پر قابو پونے کی کوشش کر رہا ہے۔

”تم کون ہو..... میں تمہیں نہیں جانتا اور اس حرکت کا کیا مطلب۔“ سلیم نے گرج کر کہا۔

”شور نہیں، شور نہیں۔“ فریدی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”تم سے زیادہ مجھے کون پہچان سکتا

ہے۔ جب کہ تم میرے جنازے میں بھی شریک تھے۔ اس کی تو میں تعریف کروں گا سلیم! تم بہت محتاط ہو۔ اگر میں اپنے مکان سے ایک عدد جنازہ نکلوانے کا انتظام نہ کرتا تو تمہیں میری موت کا ہرگز یقین نہ ہوتا۔ اخباروں میں میری موت کی خبر سن کر شاید تم رات ہی کو شہر آ گئے تھے۔ میرے لئے ہسپتال سے ایک مردہ حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہ تھا اور شاید تم نے دوسرے دن قبرستان تک میری لاش کا پیچھا کیا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم ایک اچھے سازشی ضرور ہو لیکن اچھے جاسوس نہیں۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ پانچ گولیاں کھانے کے بعد باہوش و حواس پندرہ میل کی مسافت طے کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اس رات تم نے سرجنٹ حمید کے گھر کے بھی چکر کاٹے تھے لیکن شاید اس وقت تم وہاں موجود نہ تھے جب وہ نیپالی کے بھیس میں راج روپ نگر اس لئے آیا تھا کہ ڈاکٹر تو صیف کو اس بات کی اطلاع پولیس کو کرنے سے روک دے کہ میں اس سے مل چکا ہوں اور راج روپ نگر سے واپسی پر یہ حادثہ پیش آیا۔ میں نے ایک بار رپورٹر کے بھیس میں مل کر سخت غلطی کی تھی۔ اس لئے کہ تم مجھے پہچانتے تھے اور کیوں نہ پہچانتے جب کہ میرا کوئی بار پیچھا کر چکے تھے۔ اس رات بھی تم نے میرا پیچھا کیا تھا۔ جب میں ”نیپالی کے قتل“ کے بعد گھر واپس آ رہا تھا..... پھر تم نے کبڑے کے بھیس میں سرجنٹ حمید کو غلط راہ پر لگانے کی کوشش کی۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تمہیں شبہ ہو گیا کہ میں تمہیں مشتبہ سمجھتا ہوں لہذا واپسی میں تم نے مجھ پر گولی چلائی اور رائفل پروفیسر کے ہاتھ میں دے کر فرار ہو گئے۔ پروفیسر سے گفتگو کرتے وقت میں نے اچھی طرح اندازہ لگایا تھا کہ گولی چلانا تو درکنار وہ اس رائفل کے استعمال تک سے ناواقف تھے۔ تم نے مجھے قصبے کی طرف مڑتے دیکھا، اس موقع کو غنیمت جان کر تم وہاں سے دو میل کے فاصلے پر جھاڑیوں میں جا چپے اور تم

اسی تانگے پر گئے تھے جو سڑک پر کھڑا تھا۔ تم نے خود ہی مدد کے لئے چیخ کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ پھر تم نے گولیاں چلائی شروع کر دیں۔ اسی وقت میرے ذہن میں یہ نئی تدبیر آئی جسکے نتیجے میں آج تم ایک چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی طرح بے بس نظر آ رہے ہو۔“

انسپکٹر فریدی اتنا کہہ کر سگریٹ سلگانے کے لئے رک گیا۔

”نہ جانے تم کون ہو اور کیا بک رہے ہو.....!“ سلیم نے جھنجھلا کر کہا۔ ”خیریت اسی میں ہے کہ مجھے کھول دو..... ورنہ اچھا نہ ہوگا.....!“

”ابھی تک تو اچھا ہی ہو رہا ہے.....!“ فریدی نے شانے ہلا کر کہا اور جھک کر دور بین میں دیکھنے لگا۔

قاتل فرار

”تو تم نہیں کھولو گے مجھے..... دیکھو میں کہے دیتا ہوں.....!“

”بس بس زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے ڈاکٹر شوکت کا کارنامہ دیکھنے دو.....!“

”دیکھو مسٹر.....!“ سلیم تیزی سے بولا۔ ”اول تو مجھے یقین نہیں کہ تم سرکاری جاسوس ہو اور اگر ہو بھی تو مجھے اس سے کیا سروکار۔ آخر تم نے مجھے کس قانون کے تحت یہاں باندھ رکھا ہے۔“

”اس لئے کہ تم ایک اقبالی مجرم ہو۔ ابھی ابھی تم نے اپنے جرموں کا اعتراف کیا ہے۔ کیا یہ تمہارے باندھ رکھنے کے لئے کافی نہیں۔“

”کیا حقوں کی سی باتیں کرتے ہو۔“ سلیم نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”کیا تم اسے سچ سمجھتے ہو۔“

”جھوٹ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔“ فریدی نے دور بین پر جھکتے ہوئے کہا۔

”ہوش کے ناخن لو مسٹر سراغ رساں.....!“ سلیم بولا۔ ”کچھ دیر قبل میں ایک پاگل آدمی

سے گفتگو کر رہا تھا۔ اگر میں اس کی ہاں میں ہاں نہ ملاتا تو وہ میرے ساتھ نہ جانے کیا برتاؤ کرتا۔ میں اس کے ظالمانہ رجحانات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ لہذا جان بچانے کے لئے اس کے علاوہ اور چارہ کیا تھا۔ واہ میری بھولے سراغ رساں واہ.....!“

فریدی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ سلیم کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”خیر جو ہوا سو ہوا..... مجھے فوراً کھول دو۔ انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے افسروں سے تمہاری شکایت نہ کروں گا۔“

فریدی اسے بے بسی سے دیکھ رہا تھا اور سلیم کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”خیر کوئی بات نہیں۔“ فریدی سنبھل کر بولا۔ ”لیکن آج تم نے ڈاکٹر شوکت کو قتل کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ خود میں نے دیکھی ہیں۔ ڈاکٹر شوکت کی کار میں نے بگاڑی تھی۔ میں یہ پہلے سے جانتا تھا کہ اس وقت کٹھی میں کوئی کار موجود نہیں تھی۔ میں دراصل اسے پیدل لے جانا چاہتا تھا۔ محض یہ دیکھنے کے لئے کہ حقیقتاً سازشی کون ہے۔ کیا تم کار کا بہانہ کر کے وہاں سے نہیں نکل گئے تھے..... کیا تم نے پروفیسر کو زہریلی سوئی دے کر اسے شوکت سے ہاتھ ملانے کے بہانے چھو دینے پر آمادہ نہیں کیا تھا۔ جب تم نے اس کے گلے میں رسی کا پھندا ڈالا تھا تب بھی میں تم سے تھوڑی ہی دور کے فاصلے پر موجود تھا اور میں نے ہی شوکت کو بچایا تھا۔“

”نہ جانے تم کون سی داستان امیر حمزہ بیان کر رہے ہو۔“ سلیم نے اکتا کر کہا۔ ”عقل مند آدمی ذرا سوچو تو آخر میں ڈاکٹر شوکت کی جان کیوں لینا چاہوں گا۔ جب کہ وہ میرے لئے قطعی اجنبی ہے۔ تم کہو گے کہ میں نے ایسا محض اس لئے کیا کہ چچا جان جانیر نہ ہو سکیں لیکن ایسا سوچنا حماقت ہوگی۔ اگر ایسا ہوتا تو میں پہلے ہی ان کا خاتمہ کر دیتا اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی۔“

”کیا کہا شوکت تمہارے لئے اجنبی ہے۔“ فریدی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”تم اس کے لئے اجنبی ہو سکتے ہو لیکن وہ تمہارے لئے نہیں۔ کیا بتاؤں کہ تم اس کی جان کیوں

لینا چاہتے ہو۔“

فریدی کے الفاظ کا اثر حیرت انگیز تھا۔ سلیم پھرست پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں خوف اور دلیری باہمی کش مکش میں جلا تھے۔ آخر کار اس نے خوف پر قابو پایا۔

”آخر تم کیا چاہتے ہو.....؟“ اس نے فریدی سے کہا۔

”تم کو قانون کے حوالے کرنا۔“

”لیکن کس قانون کی رو سے۔“

”تم نے ابھی ابھی اپنے جرموں کا اعتراف کیا ہے۔“

”اچھا چلو یہی سہی۔“ وہ فریدی کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتا ہوا بولا۔ ”لیکن تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے اقبال جرم کیا ہے۔ عدالت میں تم کے گواہ کی حیثیت سے پیش کرو گے جب کہ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا نہیں ہے۔ دیکھو مسٹر فریدی مجھے جمانا دینا آسان کام نہیں۔ تم اس طرح عدالت میں میرے خلاف مقدمہ چلا کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔“

”تب تو مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔“ فریدی نے ہاتھ ملتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ ”کاش میں سرجنٹ حمید کو بھی یہاں لایا ہوتا۔“

سلیم نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”ابھی کچھ ہو مسٹر جاسوس۔“

”اُف میرے خدایا۔“ فریدی نے بوکھلا کر کہنا شروع کیا۔ ”لیکن تم نے ابھی میرے

سامنے اقبال جرم کیا ہے کہ..... تم..... قتل..... قاتل ہو.....!“

”ہکلاؤ نہیں پیارے۔“ سلیم بے ساختہ ہنستا ہوا بولا۔ ”لو میں ایک بار پھر اقبال جرم کرتا ہوں کہ میں نے عی شوکت کو قتل کرنے یا کرانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے عی نیپالی کو بھی قتل کیا تھا۔ میں نے تم پر بھی گولیاں برسائی تھیں۔ لیکن پھر کیا؟ تم میرا کیا کر سکتے ہو۔ میں ایک خطاب یافتہ خاندان کا فرد ہوں۔ راج روپ نگر کا ہونے والا نواب..... تمہاری بکواس پر کے

یقین آئے گا۔“

”بہت اچھے برخوردار.....!“ فریدی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بہت عقل مند ہو لیکن واضح رہے کہ اب تم نے جو اقبال جرم کیا ہے وہ پاگل پروفسر کے سامنے نہیں بلکہ محکمہ سراغ رسانی کے انسپکٹر فریدی کے سامنے کیا ہے۔“

”تو پھر اس سے کیا..... میں ہزار مرتبہ اقبال جرم کر سکتا ہوں۔ کیونکہ یہاں ہم دونوں کے سوا اور کون ہے۔ کہو تو ایک بار پھر دہرا دوں۔“ سلیم نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”بس بس کافی ہے۔“ فریدی نے جلی ہوئی سگریٹ کا ٹکڑا پھینکتے ہوئے کہا۔ ”تم فریدی کو نہیں جانتے۔ ادھر دیکھو اس الماری میں..... لیکن نہیں تمہیں نہیں دکھائی دیتا۔ ٹھہرو میں موم بتی اٹھاتا ہوں۔ دیکھو بیٹا سلیم..... یہ ایک بہت زیادہ طاقت ور ٹرانسمیٹر ہے اور ابھی حال ہی کی ایجاد ہے۔ ایک مختصر سی بیڑی اُسے چلانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ کیا سمجھے اس کے ذریعہ میری اور تمہاری آوازیں محکمہ سراغ رسانی کے دفتر تک پہنچ رہی ہوں گی اور ان کا باقاعدہ ریکارڈ لیا جا رہا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ تم معمولی ذہانت کے مجرم نہیں ہو۔ اس لئے میں نے پہلے ہی اس کا انتظام کر لیا تھا۔ اب کہو کون جیتا.....؟“ فریدی نے قہقہہ لگایا اور سلیم غڈ حال ہو کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ اسے اپنا دل سر کے اس حصے میں دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا جہاں چوٹ لگی تھی۔ لیکن اس کے ذہن نے ابھی تک شکست قبول نہ کی تھی۔ سگریٹ کا جلتا ہوا ٹکڑا اس کے قریب ہی پڑا تھا۔ اس نے فریدی کی نظر بچا کر جو نہایت اطمینان سے دور بین پر جھکا ہوا تھا اسے پیر سے آہستہ آہستہ اپنی طرف کھسکانا شروع کیا۔ اب سگریٹ کا جلتا ہوا حصہ ری کے ایک بل سے لگا ہوا اسے آہستہ آہستہ جلا رہا تھا۔ سلیم نے اپنے دونوں پیر سمیٹ کر ری کے سامنے کر لئے۔ ری خشک تھی یا سلیم کی تقدیر یادور۔ آگ اپنا کام کر رہی تھی۔ فریدی بدستور دور بین پر جھکا ہوا تھا۔ دفعتاً سلیم صوفے سمیت دوسری طرف پلٹ گیا۔ فریدی چونک کر اس کی طرف جھپٹا۔ لیکن قبل اس کے کہ حیرت زدہ فریدی کچھ کر سکے سلیم ری کے بلوں سے آزاد ہو چکا تھا۔

فریدی اس پر ٹوٹ پڑا لیکن سلیم کو زیر کرنا آسان کام نہ تھا..... تھوڑی دیر بعد دونوں گتے ہوئے ہانپ رہے تھے۔ سلیم کو ست پا کر فریدی کو جیب سے پستول نکالنے کا موقع مل گیا۔ لیکن سلیم نے اس پھرتی کے ساتھ اس سے پستول چھین لیا جیسے وہ اس کا خطر تھا۔ اسی کشمکش میں پستول چل گیا۔ فریدی نے چیخ ماری اور گرتے گرتے اس کا سر دوربین سے ٹکڑا گیا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت زمین پر اوندھا پڑا تھا۔

سلیم کھڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ دفعتاً وہ ٹرانسمیٹر کے سامنے کھڑا ہو کر بُری طرح کھانسنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر کھانسیوں کا دورہ پڑا ہو۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولنے لگا۔

”میں انسپکٹر فریدی بول رہا ہوں۔ ابھی سلیم میری گرفت سے نکل گیا تھا۔ کافی جدوجہد کے بعد میں نے اس کے پیر میں گولی مار دی۔ اب وہ پھر میری قید میں ہے۔ میں اسے بقایا پولیس کے سپرد کرنے جا رہا ہوں۔ بقیہ رپورٹ کل آٹھ بجے صبح۔“

اب سلیم نے ٹرانسمیٹر کا تار بیٹری سے الگ کر دیا۔ اس کے پرزے پرزے ادھر ادھر بکھر گئے۔ وہ تیزی سے بیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔

خوفناک لمحے

انسپکٹر فریدی نے اپنی موت کی خبر شائع کرانے میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ راج روپ نگر کے جنگلوں میں دشمن سے مقابلہ کرتے وقت اچانک اس کے ذہن میں یہ تدبیر آئی تھی۔ وہ خواہ مخواہ اس طرح چیخ کر بھاگا تھا جیسے وہ زخمی ہو گیا ہو۔ وہ ہسپتال گیا اور وہاں چیف انسپکٹر کو بلوا کر اسے سارے حالات بتائے اور اس سے مدد مانگی۔ یہ چیز مشکل نہ تھی۔ چیف انسپکٹر نے پولیس کمشنر سے مشورہ کر کے پولیس ہسپتال کے انچارج کیرل ٹیواری

سے سب معاملے طے کر لئے لیکن اسے یہ نہ بتایا گیا کہ ڈرامہ کھیلنے کا مقصد کیا ہے۔ سول ہسپتال سے خفیہ طریقہ پر ایک لاش حاصل کی گئی۔ پھر اس پر انسپکٹر فریدی کا میک اپ کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ سلیم آسانی سے دھوکا کھا گیا۔ ان سب باتوں سے فرصت پانے کے بعد انسپکٹر فریدی نے بھی بدل کر اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔

تیسرے دن اچانک کرنل تیواری کے تبادلے کا حکم آ گیا اور اسے صرف اتنی ہی مہلت مل سکی کہ اس نے ڈاکٹر تو صیف کو ایک خط لکھ دیا انسپکٹر فریدی کو اب تک سلیم پر محض شبہ ہی شبہ تھا۔ اس کی تحقیقات کا رخ زیادہ تر پروفیسر عی کی طرف رہا۔ اس سلسلے میں اسے اس بات کا علم ہوا کہ سلیم پروفیسر کو دھوکے میں رکھ کر اپنے آلہ کار بنائے ہوئے ہے۔ پروفیسر کے متعلق اس نے ایک بالکل ہی نئی بات معلوم کی جس کی اطلاع سلیم کو بھی نہ تھی۔ وہ یہ کہ پروفیسر ناجائز طور پر کوکین حاصل کیا کرتا تھا..... جس طریقہ سے کوکین اس تک پہنچا کرتی تھی وہ انتہائی دلچسپ تھا۔ اسے ایک ہفتہ کے استعمال کے لئے کوکین ملا کرتی تھی۔ کوکین فروشوں کے گروہ کا ایک آدمی ہر ہفتہ ایک پیکٹ کوکین اس کے لئے لا کر پرانی کوشی کے باغیچے میں چھپا دیا کرتا تھا۔ وہیں اس کے دام بھی رکھے ہوئے مل جاتے تھے۔ دو ایک بار اسے مالیوں نے ٹوکا بھی لیکن اس نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ دوا کے لئے بیر بہوٹی تلاش کر رہا ہے۔ فریدی نے فی الحال اس گروہ کو پکڑانے کی کوشش نہ کی کیونکہ اس کے سامنے اس سے بھی زیادہ اہم معاملہ تھا۔ ڈاکٹر شوکت کے راج روپ نگر جانے سے ایک دن قبل ہی اس نے کوشی کے ایک ماں کو بھاری رقم دے کر ملا لیا تھا۔ اس لئے کوشی کے افراد کے متعلق سب کچھ جان لینے میں کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔ آپریشن والی رات کو سرجنٹ حمید بھی وہاں آ گیا..... فریدی نے اسے پروفیسر کو بہلا پھسلا کر مالی کے جھونپڑے تک لانے کے لئے تعینات کر دیا۔ اس کے لئے پوری اسکیم پہلے ہی مرتب ہو چکی تھی۔ حمید نے پروفیسر سے کوکین فروشوں کے گروہ کے ایک نمائندے کی خاموشی سے ملاقات کی اور اسے کوکین دینے کا لالچ دلا کر مالی کے جھونپڑے تک لایا۔ یہاں اسے کوکین میں کوئی تیز قسم کی منشی چیز دی گئی جس کے اثر سے پروفیسر بہت جلد بے ہوش ہو گیا۔

اس کے بعد انسپٹر فریدی نے اس کے کپڑے خود پھینک لئے اور ٹرانسمیٹر کو گٹھڑی میں باندھ کر جھونپڑے سے نکل گیا۔ جھونپڑے سے باہر جس نے اچھل کود مچائی تھی وہ انسپٹر فریدی ہی تھا۔ جب فریدی کو گئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تو حمید کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے سوچا کہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔ ہر چند کہ فریدی نے اسے بے ہوش پروفیسر کو سوتا چھوڑ کر کہیں جانے کی اجازت نہ دی تھی لیکن اس کا دل نہ مانا۔ وہ پروفیسر کو سوتا چھوڑ کر پرانی کوشی کی طرف روانہ ہو گیا۔ مینار میں وہ اس وقت داخل ہوا جب سلیم جا چکا تھا۔ ٹرانسمیٹر چور چور ہو کر فرش پر بکھرا ہوا پڑا تھا اور فریدی ابھی تک اسی طرح پڑا تھا۔ حمید بدقت تمام اپنی چیخ روک سکا۔ اس نے دوڑ کر فریدی کو اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ بے ہوش تھا..... بظاہر کہیں کوئی چوٹ نہ معلوم ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کراہ کر اس نے کروٹ بدلی۔ حمید اسے ہلانے لگا..... وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

”تم.....!“ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ ”وہ مردود کہاں گیا.....؟“

”کون.....؟“

”وہی سلیم.....!“ فریدی نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”افسوس ہاتھ آ کر نکل گیا۔“ پھر اس

نے جلدی جلدی سارے واقعات بتا دیئے۔

”اس نے تو اپنی دانت میں ماری ڈالا تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن جیسے ہی اس نے گولی چلائی..... میں نے پھر ایک بار اسے دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ لیکن بُرا ہوا اس دور بین کا کہ سب کیا دھوا خاک میں مل گیا۔ اگر میرا سر اس سے نہ ٹکرا جاتا تو پھر میں نے پالا مار لیا تھا۔ ارے اس ٹرانسمیٹر کو کیا ہوا..... توڑ دیا کم بخت نے۔ ایسا دلیر مجرم آج تک میری نظروں سے نہیں گذرا.....!“

”آئیے..... تو چلے آئے تلاش کریں۔“ حمید نے کہا۔

”پاگل ہوئے ہو..... اب تم اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔ وہ معمولی ذہانت کا آدمی

نہیں۔“ فریدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھوں تو آپریشن کا کیا رہا.....!“

اس نے دو رہین کے شیشے سے آنکھ لگا دی۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔

”ارے.....!“ وہ چونک کر بولا۔ ”یہ پاپ کے سہارے دیوار پر کون چڑھ رہا ہے۔“
 ”سلیم..... اس کا کیا مطلب..... ارے وہ تو کھڑکی کے قریب پہنچ گیا..... یہ اس نے جیب سے کیا چیز نکالی..... ہیں..... یہ نگی کیسی..... ارے لو غضب وہ نگی کو ہوتوں میں دبا رہا ہے..... قتل قتل..... حمید اب ڈاکٹر شوکت اتنی خاموشی سے قتل ہو جائے گا کہ اس کے قریب کھڑی نرس کو بھی اس کی خبر نہ ہوگی۔ اُف کیا کیا جائے..... جتنی دیر میں ہم وہاں پہنچیں گے وہ اپنا کام کر چکا ہوگا۔ کم بخت پستول بھی تو اپنے ساتھ لیتا گیا۔“
 ”پستول میرے پاس ہے.....!“ حمید نے کہا۔

”لیکن بے کار..... اتنی دور سے پستول کس کام کا..... اوہ کیا کیا جائے۔ اس کی نگی میں وہ زہریلی سوئی ہے۔ ابھی وہ ایک پھونک مارے گا اور سوئی نگی سے نکل کر ڈاکٹر شوکت کے جا لگے گی۔ اُف میرے خدا..... اب کیا ہوگا۔ وہ شاید نشانہ لے رہا ہے۔ اوہ ٹھیک یاد آ گیا..... میں نے وہ رائفل نیچے دیکھی تھی۔ ٹھہرو..... میں ابھی آیا!“ فریدی یہ کہہ کر دوڑتا ہوا نیچے چلا گیا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں وہی چھوٹی سی ہوائی رائفل تھی جو اس نے پروفیسر کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس کی میگزین میں کئی کارتوس باقی تھے۔

”ہو..... ہو..... کھڑکی سے جلدی ہو۔ اس نے کھڑکی سے نشانہ لیا۔ بیمار کے کمرے سے آتی ہوئی روشنی میں سلیم کا نشانہ صاف نظر آ رہا تھا۔ فریدی نے رائفل چلا دی۔ سلیم اچھل کر ایک دھماکے کے ساتھ زمین پر آ رہا.....!“

”وہ مارا.....!“ اس نے رائفل پھینک کر زینے کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔ حمید بھی اس کے پیچھے تھا۔ یہ لوگ اس وقت پہنچے جب بیگم صاحبہ، نجمہ، ڈاکٹر توصیف اور کئی ملازمین وہاں اکٹھے ہو چکے تھے۔ عورتوں کی چیخ و پکار سن کر ڈاکٹر شوکت بھی نیچے آ گیا تھا۔

فریدی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”کہو ڈاکٹر آپریشن کا کیا رہا.....“
 شوکت چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”تم.....!“ اس نے منہ پھاڑے ہوئے حیرت سے کہا۔

”ہاں ہاں میں بھوت نہیں۔ بتاؤ آپریشن کا کیا رہا۔“

”کامیاب.....!“ شوکت نے بوکھلا کر کہا۔ ”لیکن..... لیکن.....!“

”میں محض تمہارے لئے مرا تھا..... میرے دوست اور یہ دیکھو آج جس نے تمہارے

گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا تھا تمہارے سامنے مردہ پڑا ہے۔“

اب سارے لوگ فریدی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آپ لوگ براہ کرم لاش کے قریب سے ہٹ جائیے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور حمید تم

ڈاکٹر شوکت کی کار پر تھانے چلے جاؤ۔“

”تم کون ہو.....!“ بیگم صاحبہ گرج کر بولیں۔

”محترمہ میں محکمہ سراغ رسانی کا انسپکٹر ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں سرکس والے نیپالی

کے قاتل اور ڈاکٹر شوکت کی جان لینے کی کوشش کرنیوالے کی لاش تھانے میں لے جانا چاہتا ہوں۔“

”نہ جانے تم کیا بک رہے ہو۔“ نجمہ نے آنسو پونچھتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”جو کچھ میں بک رہا ہوں اس کی وضاحت قانون کرے گا۔“

انکشاف

ایک ہفتے کے بعد نجمہ اور ڈاکٹر شوکت کوٹھی کے پائیں باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔

”اُف فوہ کس قدر شریر ہو تم نجمہ.....!“ شوکت نے کہا۔ ”آخر بیچارے مالیوں کو تنگ

کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ کیاریاں جو تم نے بگاڑ دی ہیں۔ مالی اسکا غصہ کسی کے اوپر اتاریں گے۔“

”میں نے اس لئے بگاڑی ہیں یہ کیاریاں کہ میں تمہارا امتحان لینا چاہتی ہوں۔“

”کیا مطلب.....!“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

”یہی کہ تم ان کا آپریشن کر کے انہیں پھر ٹھیک کر دو گے۔“ نجمہ نے شوخی سے کہا۔
 ”انہیں تو نہیں..... لیکن شادی ہو جانے کے بعد تمہارا آپریشن کر کے تمہیں بندر یا ضرور
 دوں گا۔“

”شادی..... بہت خوب..... غالباً تم یہ سمجھتے ہو کہ میں بیچ بچ تم سے شادی کر لوں گی۔“
 ”تم کرو یا نہ کرو لیکن میں تو کر ہی لوں گا۔“
 ”تو مجھے بندر یا بتانے سے کیا فائدہ..... کیوں نہ تمہارے لئے ایک بندر یا کچل والی
 جائے۔ آپریشن کی زحمت سے بچ جاؤ گے۔“

”اچھا ٹھہرو بتانا ہوں..... بلو بھائی فریدی۔ آؤ آؤ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔“
 فریدی اور حمید کار سے اتر رہے تھے۔

”نواب صاحب کا کیا حال ہے۔“ فریدی نے شوکت سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
 ”اچھے ہیں..... تمہیں یاد کر رہے تھے۔ آؤ چلو اندر چلیں۔“
 نواب صاحب گاؤں کے سے ٹیک لگائے انگوڑ کھا رہے تھے۔ فریدی کو دیکھ کر بولے۔

”آؤ آؤ میاں فریدی..... میں آج تمہیں یاد ہی کر رہا تھا۔ میں نے اس وقت تمہیں
 دیکھا تھا جب مجھے بولنے کی اجازت نہ تھی۔ آج کل تو میرے بیٹے کا حکم مجھ پر چل رہا ہے۔“
 نواب صاحب نے شوکت کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کو اچھا دیکھ کر مجھے انتہائی مسرت ہے۔“ فریدی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
 تھوری دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد نواب صاحب نے کہا۔ ”فریدی میاں تمہیں
 اس بات کا علم کیونکر ہوا تھا کہ شوکت میرا بیٹا ہے۔“

”میں داستان کا بقیہ حصہ آپ کی زبانی سننا چاہتا تھا۔“ فریدی نے کہا۔

”نہیں بھئی..... پہلے تم بتاؤ۔“ نواب صاحب بولے۔

”میری کہانی زیادہ لمبی نہیں..... صرف دو لفظوں میں ختم ہو جائے گی۔ جب میں پہلی بار
 سلیم سے رپورٹر کے بھیس میں ملا تھا..... اس وقت میں نے آپ کے والد ماجد کی تصویر دیکھ کر

اندازہ لگایا تھا کہ اس کوٹھی کا کوئی فرد ڈاکٹر شوکت کو کیوں قتل کرنا چاہتا ہے۔ شوکت کی شکل ہو بہو نواب صاحب مرحوم کے ملتی ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ جس بات کا علم ڈاکٹر شوکت کو نہیں تھا اس کا علم سلیم کو کیونکر ہوا۔“

”عالمی میں بیہوشی کے دوران میں کچھ بک گیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سلیم زیادہ تر میرے قریب ہی رہتا تھا۔ فریدی میاں یہ ایک بہت ہی پروردارستان ہے۔ میں تمہیں شروع سے سنا تا ہوں۔ شوکت کی ماں ہمارے خاندان کی نہ تھی۔ لیکن وہ کسی نچلے طبقے سے بھی تعلق نہ رکھتی تھی۔ ان میں صرف اتنی خرابی تھی کہ ان کے والدین ہماری طرح دولت مند نہ تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے لیکن والد صاحب مرحوم کے ڈر سے کھلم کھلا شادی نہ کر سکتے تھے۔ لہذا ہم نے چھپ کر شادی کر لی۔ ایک سال کے بعد شوکت پیدا ہوا لیکن اس کی پیدائش کے چھ ماہ بعد ہی وہ ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو گئیں۔ اسی حالت میں وہ دو سال تک زندہ رہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو جاگیردارانہ ماحول سے الگ رکھ کر اعلیٰ تعلیم دلائیں۔ وہ ایک رحم دل خاتون تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے خدمت خلق کرے۔ یہ ان کا خیال تھا اور بالکل درست تھا۔ کہ جاگیردارانہ ماحول میں پلے ہوئے بچے کے دل میں غریبوں کا درد قطعی نہیں ہو سکتا۔ جب وہ دم توڑ رہی تھی تو انہوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ اس وقت تک میں شوکت پر یہ بات ظاہر نہ کروں گا جب تک وہ ان کی خواہش کے مطابق ایک اچھے کردار کا مالک نہ ہو جائے گا۔ پھر انہوں نے شوکت کو سیتا دیوی کے سپرد کر دیا۔ میں خفیہ طور پر سیتا دیوی کی مدد کیا کرتا تھا۔ خدا جنت نصیب کرے اسے بڑی خوبیوں کی مالک تھی۔ آخر کار اس نے شوکت کے لئے جان دے دی۔ شوکت کی ماں کے انتقال کے بعد میرا دل ٹوٹ گیا اور پھر میں نے دوسری شادی نہیں کی اور دنیا بھی سمجھتی رہی کہ میں ساری زندگی کنوارا ہی رہا۔“

نواب صاحب نے پھر شوکت اور نجمہ کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”اب میری زندگی میں پھر سے بہار آگئی ہے..... اے خدا..... اے خدا!“ ان کی آواز گلوگیر ہو گئی

اور ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔

”فریدی میاں.....!“ نواب صاحب بولے۔ ”اس سلسلے میں تمہیں جو پریشانیاں اٹھانی پڑی ہیں ان کا حال مجھے معلوم ہے۔ بخدا میں تمہیں شوکت سے کم نہیں سمجھتا۔ تم بھی مجھے اتنے ہی عزیز ہو جتنے کہ شوکت اور نجمہ.....!“

”بزرگانہ شفقت ہے آپ کی.....!“ فریدی نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔
 ”ہاں بھی..... وہ بیچارے پروفیسر کا کیا ہوا۔ کیا وہ کسی طرح رہا نہیں ہو سکتا۔“ نواب صاحب بولے۔

”تاوقتیکہ کوکین فروشوں کا گروہ گرفتار نہ ہو جائے۔ ضمانت بھی نہیں ہو سکتی۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن میں اسے بچانے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔“

”اچھا بھی اب تم لوگ جا کر چائے پیو۔ ارے ہاں ایک بات تو بھول ہی گیا۔ اگلے مہینے شوکت اور نجمہ کی شادی ہو رہی ہے۔“ نواب صاحب نے نجمہ اور شوکت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی سے کہہ دیتا ہوں فریدی میاں کہ تمہیں اور حمید صاحب کو شادی سے ایک ہفتہ قبل ہی چھٹی لے کر یہاں آ جانا پڑے گا۔“

”ضرور ضرور.....!“ فریدی نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مبارک ہو.....!“
 نجمہ اور شوکت نے شرم کر سر جھکا لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد چاروں ڈرائنگ روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔
 ”بھی فریدی تم کب شادی کر رہے ہو؟“ ڈاکٹر شوکت نے چائے کا گھونٹ لے کر پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”کس کی شادی.....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اپنی بھی.....!“

”اوہ..... میری شادی.....!“ فریدی نے ہنس کر کہا۔ ”سنو میاں شوکت اگر میری شادی ہوتی تو تمہاری شادی کی نوبت نہ آتی۔“

”وہ کیسے...؟“

”سیدھی سی بات ہے۔ اگر میری شادی ہوگئی ہوتی تو میں بچوں کو دودھ پلاتا یا سراغ رسانی کرتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ کوئی شادی شدہ شخص کامیاب جاسوس ہو ہی نہیں سکتا۔“
 ”تب تو مجھے ابھی سے استعفیٰ دینا چاہئے۔ میں شادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“ حمید نے اتنی معصومیت سے کہا کہ سب ہنسنے لگے۔

”تو پھر کیا تم ساری زندگی کنوارے ہی رہو گے۔“ شوکت نے کہا۔
 ”ارادہ تو یہی ہے۔“ فریدی نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔
 ”بھی تم بُری طرح سگار پیتے ہو۔ تمہارا پیچھڑا بالکل سیاہ ہو گیا ہوگا۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔

”اگر سگار بھی نہ پیوں تو پھر زندگی میں رہ ہی کیا جائے گا۔“
 ”تو یہ کہئے کہ سگار ہی شریک زندگی ہے۔“ نجمہ ہنس کر بولی۔
 حمید قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ بقیہ لوگ صرف مسکرا کر رہ گئے۔ حالانکہ یہ کوئی ایسا پر مذاق جملہ نہیں تھا۔ لیکن فریدی حمید کی عادت سے واقف تھا۔ وہ عورتوں کے پھوہڑ جملوں پر خوب محظوظ ہوا کرتا تھا۔

”ہاں بھی فریدی یہ بتاؤ کہ تم مرے کس طرح تھے۔ مجھے یہ آج تک معلوم نہ ہو سکا۔“
 ڈاکٹر شوکت نے پوچھا۔

”یہ ایک لمبی داستان ہے لیکن میں مختصر آیتاؤں گا۔ مجھے شروع ہی سے سلیم پر شبہ تھا لیکن میں نے شروع ہی میں ایک بنیادی غلطی کی تھی۔ جس کی بناء پر مجھے مرنا پڑا۔ حالانکہ میں پہلے سے جانتا تھا کہ نیپالی کا قاتل ہم لوگوں کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ ہم لوگوں کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھ سے جو غلطی ہوئی وہ یہ تھی کہ میں سلیم سے رپورٹ کے بھس میں ملا تھا۔ وہ مجھے پہچان گیا اور اس نے واپسی پر مجھ پر ہوائی رائفل سے فائر کیا۔ لیکن ناکام رہا۔ اس نے رائفل پر وفسر کے ہاتھ میں تھام دی اور خود غائب ہو گیا۔ پروفیسر کے متعلق تو تم جانتے ہو کہ وہ

کچھ خطی سا واقع ہوا ہے۔ سلیم اسے اپنا آلہ کار بنائے ہوئے تھا۔ کئی سال کی بات ہے جب پروفیسر یہاں نہیں آیا تھا اچھا خاصا تھا وہ ان دنوں ایک تجربہ کر رہا تھا۔ اس نے چاند کا سفر کرنے کے لئے ایک غبارہ بنایا تھا۔ تجربہ کے لئے اس نے پہلی بار اپنے اسٹنٹ نعیم کو اس غبارے میں بٹھا کر اڑایا، شاید نعیم غبارے کو اتارنے کی تدبیر بھول گیا تھا یا یہ کہ اس کی مشین خراب ہو گئی تھی۔ غبارہ پھر پروفیسر کی دانست میں زمین کی جانب نہ لوٹا حالانکہ اس کا خیال غلط تھا۔ نعیم غبارے سمیت مدراس کے ایک گاؤں میں گرا حالانکہ اسے کافی چوٹیں آئی تھیں لیکن گاؤں والوں کی تیار داری اور دیکھ بھال کی بناء پر بچ گیا۔ اسی دوران اسے ایک بازاری لڑکی سے عشق ہو گیا اور وہ وہیں رہ گیا۔ پروفیسر ان سب باتوں سے ناواقف تھا۔ وہ خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ اس پریشانی میں وہ قریب قریب پاگل ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے شہر کی سکونت ترک کر دی اور راج روپ نگر میں آ گیا۔ نعیم نے اسے خط لکھے جو اس کی پرانی قیام گاہ سے پھرتے پھرتے یہاں راج روپ نگر پہنچے۔ وہ خطوط کسی طرح سلیم کے ہاتھ لگ گئے اور اس طرح اسے ان واقعات کا علم ہو گیا۔ اب اس نے پروفیسر پر اپنی واقفیت کی دھونس جما کر بلیک میل کرنا شروع کیا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم اس وقت ہوا جب میں ایک رات چوروں کی طرح اس کوٹھی میں داخل ہوا اور سلیم کے کمرے کی تلاشی لی۔ نعیم کے لکھے ہوئے خطوط اچانک مل گئے۔ اس طرح میں معاملات کی تہہ تک پہنچ گیا اور اسی وقت میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا کہ مجھ پر گولی سلیم ہی نے چلائی تھی۔ کیونکہ پروفیسر تو اس رائل کے استعمال سے ناواقف تھا۔

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ہاں تو بات سمیرنے مرنے کی تھی۔ جب میں سلیم اور ڈاکٹر توصیف سے مل کر واپس جا رہا تھا۔ سلیم نے راستے میں دھوکا دے کر مجھے روکا اور جہاز یوں کی آڑ سے مجھ پر گولیاں چلانے لگا۔ میں نے بھی فائر کرنے شروع کر دیئے۔ اسی دوران میں اچانک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ مجھے کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کرنا چاہئے کہ اب میرا وجود اس دنیا میں نہیں، ورنہ ہوشیار مجرم ہاتھ آنے سے رہا۔ لہذا میں نے ایک چیخ ماری اور بھاگ کر اپنی کار میں آیا اور شہر کی طرف چل پڑا۔ میں سیدھا ہسپتال پہنچا اور

وہاں کپاؤٹ میں موٹر سے اترتے وقت غش کھا کر گر پڑا۔ لوگوں نے مجھے اندر پہنچایا۔ میں نے ڈاکٹر کو اپنی ساری اسکیم سے آگاہ کر دیا اور اپنے چیف کو بلوا بھیجا۔ اسے بھی میں نے سب کچھ بتایا۔ پھر وہاں سے میرے جنازے کا انتظام شروع ہوا۔ قسمت میرے ساتھ تھی اس دن اتفاق سے ہسپتال میں ایک لاوارث مریض مر گیا تھا۔ میرے ٹکڑے کے لوگ اسے اسٹریچر پر ڈال کر اچھی طرح ڈھانک کر میرے گھر لے آئے۔ پڑوسی اور دوسرے جاننے والے اسے میری لاش ہی سمجھے۔ میری موت کی خبر اسی دن شام کے اخبارات میں شائع ہو گئی تھی۔ پھر میں نے اسی رات حمید کو ایک نیپالی کے بھیس میں ڈاکٹر توصیف کے پاس بھیجا اور اسے تاکید کر دی کہ وہ میری راج روپ نگر میں آمد کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہے۔ لہذا یہ بات چھپی ہی رہی کہ اس دن میں راج روپ نگر گیا تھا۔ اس طرح سلیم دھوکا کھا گیا۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ اس پر شبہ کرنے والا اب اس دنیا سے چل بسا اور اب وہ نہایت آسانی کیساتھ اپنا کام انجام دے سکے گا۔

میں چاہتا تھا کہ تمہیں کسی طرح راج روپ نگر لے جاؤں۔ لہذا میں نے ڈاکٹر توصیف سے دوبارہ کہلوا بھیجا کہ ذرا جلد از جلد تمہیں راج روپ نگر لے جائے۔ جب تم وہاں پہنچے تو میں سائے کی طرح تمہارے پیچھے لگا رہا۔ تمہاری کار میں نے ہی خراب کی تھی۔ مجھے یہ پہلے ہی معلوم تھا کہ اس وقت کوٹھی میں کوئی کار موجود نہیں ہے لہذا میں نے یقین کر لیا کہ تم اس صورت میں پیدل ہی جاؤ گے۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ سلیم تمہیں نواب صاحب کے آپریشن سے پہلے ہی ختم کرنے کی کوشش کرے گا لہذا میں نے اسے موقع واردات ہی پر گرفتار کرنے کے لئے تمہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن اس کم بخت نے وہ حربہ استعمال کیا جس کا مجھے گمان تک نہ تھا۔ تم واقعی قسمت کے اچھے تھے کہ وہ سوئی پروفسر کے ہاتھ سے گر گئی ورنہ تم ختم ہو جاتے اور مجھے پتہ بھی نہ چلتا۔ اس کے بعد تم قصبے میں چلے گئے اور میں ایک مالی کے خالی جھونڈے میں بیٹھ کر پلان بناتا رہا۔ یہ تو مجھے تمہاری زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ تم شام کو بھی پیدل ہی آؤ گے۔ اسی دوران مجھے پروفسر کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ مثلاً ایک تو یہی کہ وہ کوکین کھانے کا عادی ہے اور غیر قانونی طریقہ پر اسے حاصل کرتا ہے لو بھلا دیکھو باتوں ہی باتوں

میں بہکتا چلا جا رہا ہوں۔ باقی حالات بتانے سے کیا فائدہ..... وہ تو تم جانتے ہی ہو گے۔
بہر حال یہ تھی میرے مرنے کی داستان۔“

”خدا تمہاری مغفرت کرے۔“ ڈاکٹر شوکت نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو فریدی بھائی..... اب تو آپ کی ترقی ہو جائے گی۔ دعوت میں ہمیں نہ بھولنے گا۔“
نجر نے مسکرا کر کہا۔

”میں ترقی کب چاہتا ہوں۔ اگر ترقی ہو گئی تب تو مجھے شادی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس صورت میں مجھے آفس ہی میں بیٹھ کر کھیاں مارنی پڑیں گی۔ پھر دن بھر کھیاں مارنے کے بعد گھر پر تو مجھ سے کھیاں نہ ماری جائیں گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گھر پر کھیاں مارنے کے لئے مجھے ایک عدد بیوی کا انتظام کرنا ہی پڑے گا جو میرے بس کا روگ نہیں۔“

”نجر شاید تم یہ نہیں جانتے کہ ہمارے فریدی صاحب سراغ رسانی کا شوق پورا کرنے کے لئے اس محکمے میں آئے ہیں۔“ ڈاکٹر شوکت نے کہا۔ ”ورنہ یہ خود کافی مالدار آدمی ہیں اور اتنے کنبوس ہیں کہ خدا کی پناہ۔“

”اچھا..... یہ میں آج ایک نئی خبر سن رہا ہوں کہ میں کنبوس ہوں۔ کیوں بھائی میں کنبوس کیسے ہوں۔“

”شادی نہ کرنا کنبوسی نہیں تو اور کیا ہے۔“ نجر نے کہا۔

”اچھا بھائی حمید اب چلنا چاہئے ورنہ کہیں یہ لوگ سچ بچ میری شادی نہ کرادیں۔“
فریدی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ابھی بیٹھے نا..... ایسی جلدی کیا ہے۔“ نجر بولی۔

”نہیں بہن اب چلوں گا۔ کئی ضروری کام ابھی تک ادھورے پڑے ہیں۔“

نجر اور شوکت دونوں کو کار تک پہنچانے آئے۔ دونوں کے چلے جانے کے بعد شوکت بولا۔ ”ایسا حیرت انگیز آدمی میری نظروں سے نہیں گزرا۔ پتہ نہیں پتھر کا بنا ہے یا لوہے کا..... میں نے آج تک اسے یہ کہتے نہیں سنا کہ آج میں بہت تھکا ہوا ہوں۔“

”اس کے برخلاف سرجنٹ حمید بالکل مرغی کا بچہ معلوم ہوتا ہے۔“ نجر ہنس کر بولی۔
 ”کیوں.....؟“

”نہ جانے کیوں مجھے اس کی ناک دیکھ کر مرغی کے بچے یاد آ جاتے ہیں۔“
 ”بہر حال آدمی خوش مزاج ہے۔ اچھا آؤ اب اندر چلیں..... سردی تیز ہوتی جارہی
 ہے۔“

تمام شد